منشا یاد
کے
بہترین افسانے
مرتبہ: امجد اسلام امجد

منشا یاد کے بہترین افسانے

مرتب

امجد اسلام امجد

ha

ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی

سنہ اشاعت : ۱۹۹۳ء
کتابت : محمد سالم
طباعت Nice Printing Press, Delhi.
ناشر : ادب پبلی کیشنز، ۳۶۴ اے، چراغ دلی، نئی دہلی
قیمت : ۱۵۰ روپے

MANSHA YAAD KE BEHTAREEN AFSANE
Edited by
Amjad Islam Amjad

HAR-ANAND PUBLICATIONS
364 A, Chirag Delhi, New Delhi - 110 017

فہرست

پیش لفظ

ہندوستان میں آزادی کے بعد ایک نئے نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہو چکا ہے جس میں تمام ہندوستانی زبانیں شریک ہیں۔ ہندوستانی زبانوں میں ایک نیا ادب لکھا جارہا ہے اور نئے نئے فکری کارنامے سامنے آرہے ہیں۔ لیکن اچھی کتابوں کی اشاعت میں اب بھی طرح طرح کی دقتیں ہیں اور معیاری کتابوں کو چھپوانے میں مصنفین اور شعرا کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اردو زبان کے حالات کسی سے پوشیدہ نہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو ہندوستانی زبانوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ پاکستان میں بھی اردو زبان کی خاصی اہمیت ہے۔ اردو زبان علاقائی ثقافتوں میں اشتراک، اتحاد اور رفاقت کا وہ رابطہ ہے جسے زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کا چلن برصغیر کے باہر بھی رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ نئے حالات نے اردو کے لیے نئے چیلنج پیدا کر دیے ہیں۔ نئے مطالبات کا سامنا کرنے اور اردو کو ترقی دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ معیاری کتابوں کی اشاعت کو فروغ دیا جائے۔ خوشی کا مقام ہے کہ ادب پبلی کیشنز کے تحت 'ہر آنند' نے اردو کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بنایا ہے۔ اس اشاعتی پروگرام کے لیے ایک دس رکنی ایڈیٹوریل بورڈ کی تشکیل کی گئی ہے جو نمائندہ ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل ہے۔ اس میں ہندوستان و پاکستان کے علاوہ برطانیہ، کینڈا اور دوسرے ممالک کے ممتاز ادیب و دانشور شامل ہیں، اشاعتی پروگرام میں ذیل کے شقوں کو ترجیح دی جائے گی :

۱۔ اعلیٰ شعری اور نثری ادب کے جامع انتخابات
۲۔ شعرا اور مصنفین کی بہترین تخلیقات پر مبنی کتابیں
۳۔ سوانح نیز خود نوشت سوانح حیات
۴۔ تحقیقی، تنقید اور علمی کتب
۵۔ خواتین کی کتابیں اور خواتین کے مسائل سے متعلق کتابیں
۶۔ بچوں کا ادب
۷۔ اعلیٰ درجے کے ناول، افسانے، ڈرامے اور شعری مجموعے

اردو کتابوں کے پہلے سیٹ کے طور پر ذیل کی کتابیں مارچ ۱۹۹۳ء تک منظرِ عام پر آ رہی ہیں:

۱۔ رام لعل کے بہترین افسانے	رام لعل
۲۔ منشا یاد کے بہترین افسانے	امجد اسلام امجد
۳۔ چانکیہ کی ارتھ شاستر کا اردو ترجمہ	ڈاکٹر شان الحق حقی
۴۔ عورت مرد کا رشتہ	کشور ناہید
۵۔ جزیرہ	جتیندر بلّو
۶۔ اردو اور سیکولرزم	اقبال احمد خاں
۷۔ اکثر یاد آتے ہیں	مظہر امام

زیرِ نظر کتاب پاکستان کے منفرد افسانہ نگار منشا یاد کے بہترین افسانوں پر مشتمل ہے۔ محمد منشا یاد کا تعلق انتظار حسین کے بعد کی نسل سے ہے۔ ان کے اردو افسانوں کے پانچ مجموعے (بند مٹھی میں جگنو، ماس اور مٹّی، خلا اندر خلا، وقت سمندر اور درخت آدمی) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں نئے افسانے کی عمومی فارمولا زدگی سے ایک واضح گریز ملتا ہے۔ انھوں نے حقیقت بیانی اور فینٹسی کے بیچ ایک الگ راہ نکالی ہے جو شہروں سے الگ چوپال کے قصّے کہانیوں کی روایت سے ملتی جلتی ہے لیکن منشا یاد کا بیانیہ فقط سطح پر نہیں گہرائی میں بھی چلتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ پچھلوں سے الگ بھی ہیں اور ان سے جڑے ہوئے بھی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں پنجاب کے قصبوں کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اور اس زندگی کا بھرا پرا پن ہے جس میں صدیوں سے چلی آ رہی سادگی اور معصومیت بھی ہے اور زمین سے جڑے ہوئے انسان کی بنیادی خواہشیں اور تضادات بھی۔ منشا یاد اپنے معاصرین میں اس لحاظ سے الگ پہچانے جاتے ہیں کہ انھیں قصباتی کرداروں سے ہم کلامی کا گر آتا ہے اور باطن میں جھانکنے کا عمل ان کے آرٹ فارم کا حصّہ ہے۔ ان کی کہانیاں ہندوستان کے رسائل و جرائد میں تو شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن ان کے افسانوں کا مجموعہ ہندوستان میں غالباً پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ امید ہے قارئین اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

(پروفیسر) گوپی چند نارنگ
چیرمین اردو ایڈیٹوریل بورڈ
ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی

محمدّ منشایاد ــــ ایک انوکھا قصّہ گو

محمد منشایاد میرے نزدیک جدید اردو افسانے کا سب سے معتبر حوالہ ہے گزشتہ بیس برس میں اس کی کہانیوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے ہیں اور ہر مجموعہ اس کے فن اور فکر کی ترقی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایسی انوکھی، اچھوتی، فکر انگیز اور شرف انسانی کی بحالی کے سوز میں ڈوبی ہوئی کہانیاں اسے اس کے ہم عصروں میں ہی ممتاز نہیں کرتیں بلکہ اردو افسانے کے پورے تناظر میں بھی ایک بلند مقام پر فائز نظر آتی ہیں، ۱۹۴۷ سے ۱۹۶۰ تک کی دو دہائیوں میں اردو افسانے نے ایسی حیرت انگیز ترقی کی ہے جس کی نظیر اس وقت کے عالمی ادب میں کہیں بھی نظر نہیں آتی بالکل اسی طرح جیسے گزشتہ دو دہائیوں میں لاطینی امریکہ میں لکھا جانے والا افسانہ اپنی مثال آپ ہے۔ اردو افسانہ ساٹھ اور سترّ کی دہائیوں میں پٹری سے اتر گیا تھا اس کی بہت سی وجوہات بیان کی جاتی ہیں اگر ان سب کو سچ مان بھی لیا جائے تب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ "جدیدیت" کے بخار نے افسانے میں سرسام کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی اور ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب یہ مریض بچتا دکھائی نہیں دیتا تھا ایسے میں جو نوجوان لوگ مسیحا بن کر ابھرے میرے نزدیک ان میں منشایاد کا نام سب سے اوپر ہے، (کہانی کاروں کے اس تازہ تر کارواں میں مظہرالاسلام، نجم الحسن رضوی، منیر احمد شیخ، اسد محمد خاں، امراؤ طارق، سلطان جمیل نسیم، امر جلیل، طارق محمود، سعید شیخ،

نیلوفر اقبال اور عطیہ سیّد کے علاوہ اور بھی کئی نام ہیں۔)

میں علامتی افسانے کے خلاف نہیں ہوں لیکن وہ علامت جو افسانہ نگار کی ژولیدہ خیالی کے فشار میں بے چہرہ ہو جائے مجھے وارا نہیں کھاتی، اسی طرح وہ کہانیاں بھی میرے دل کو نہیں چھوتیں جو حقیقت سے قطع تعلق کر کے انسان کی باطنی کشمکش کے ایسے منظر نامے پیش کرتی ہیں جن میں مصنف کی فکر اور مکالمہ اپنی زمین کے بجائے انسان کی اس تنہائی اور زندگی کی لایعنیت کے تصور سے پیدا ہوتے ہیں جن کا چرچا ہمیں مغرب کے جدید ادب میں سنائی دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دو عظیم جنگوں کے بعد یورپ میں آزادی کی تحریکوں اور ان کے حصول کے بعد تیسری دنیا میں انسانی رشتوں کا ایک بالکل نیا اور بہت پیچیدہ جہان آباد ہوا ہے اور اقدار کا ایک ایسا تصور ابھرا ہے جسے پچھلی صدی کا انسان شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر ادب کا کام حسن وفا شناس کی طرح ہوا کے رُخ پر اڑنا نہیں ہوتا۔ یہاں تو تینوں زمانے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا ہے سو مجھے اب بھی دل سے وہی کہانیاں اچھی لگتی ہیں جن میں کہانی پن ہو، انسان ہوں، ان کے دکھ درد اور خوشیاں ہوں اور میں انھیں دُنیا کی اس بھیڑ میں کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ پہچان سکوں، اسی طرح میں ہیئت اور اظہار کے تجربوں اور نت نئی ہیئتوں کی تلاش اور دریافت کے عمل کے بھی خلاف نہیں گڑبڑ اس وقت ہوتی ہے جب یہ عمل ذریعے کے بجائے مقصود بالذات بن جاتا ہے لباس کا شخصیت سے بہت گہرا تعلق ہے اور یہ شخصیت کے نکھار کا باعث بھی بنتا ہے لیکن صرف اس وقت جب اسے پہننے والے کے جسم کی تراش خراش کے مطابق تیار کیا گیا ہو اور صحیح موقعے پر پہنا جائے۔

منشا یاد اور اس کے بہت سے ہم عصر علامت نگاروں میں بنیادی فرق یہی ہے وہ علامت کو Obsession نہیں بناتا اور اِسے اسی قدر استعمال کرتا ہے جتنی ضرورت ہو اس کی کہانیوں میں موضوع اور ہیئت کا یہی خوب صورت توازن ہے

جس نے اس کے اسلوب کو انفرادیت عطا کی ہے " بند مٹھی میں جگنو " سے " درخت آدمی تک اس کی بہت سی کہانیوں کا اسلوب جدید اور جدید تر ہونے کے باوجود اپنی زمین، ماحول، عوام، حقیقت نگاری اور کہانی پن سے اس طرح روشن اور معطر ہے کہ علامت کہیں بھی آپ کا راستہ نہیں روکتی، کہیں بھی آپ کو گمراہ نہیں کرتی اور کہیں آپ سے پہاڑے نہیں سنتی۔

منشا یاد کی کہانیوں کی تعریف جس قدر آسان ہے ان کا انتخاب اسی قدر مشکل ہے کیوں کہ یہاں معاملہ یہ نہیں کہ کون سی کہانی منتخب کی جائے مسئلہ یہ ہے کہ کون سی چھوڑی جائے اور کس بنیاد پر؟

اس انتخاب میں جو کہانیاں آپ موجود پائیں گے انھوں نے اپنے آپ کو خود منتخب کرایا ہے اِنہی کے مرتبے کی بہت سی کہانیاں جو شامل نہیں ہوسکیں انھیں آپ اس " انتخاب " کی وسعتِ داماں کی تنگی سے منسوب کرسکتے ہیں کیوں کہ کھانا کتنا ہی لذیذ اور عمدہ کیوں نہ ہو ایک وقت میں تو سارے کا سارا نہیں کھایا جاسکتا !

میں نے کوشش کی ہے کہ اس مجموعے میں منشا کی تمام کتابوں کی متناسب نمائندگی ہوجائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے اسلوب کی وہ تمام ارتقائی منازل بھی نمایاں ہوسکیں جن سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچا ہے آپ محسوس کریں گے کہ یہ افسانہ نگار اپنا سب سے بڑا نقّاد خود ہے۔ وقت کے ساتھ اس کی کہانیوں اور اسلوبِ بیان میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کا بغور مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کو سمجھا اور انھیں دور کیا ہے اور اپنے فن کے محکم اور خوبصورت حصوں کو کس چابک دستی سے برتا اور بڑھایا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ محمد منشا یاد کی کہانیوں کا یہ انتخاب ہندوستان کے اردو داں اور اردو خواں حلقوں میں اس بے مثال کہانی کار کا، بھرپور تعارف کرائے گا جو پاکستانی رسائل اور کتب تک کم رسائی کی وجہ سے اسے جانتے تو ہیں مگر اس

کے فن اور کمالِ فن سے مکمل طور پر آگاہ نہیں ہیں اور اس کتاب کے توسط سے وہ اس کے باقی افسانوں کو بھی تلاش کرنے لگیں گے۔

امجد اسلام امجد

لاہور

دوپہر اور جگنو

اس کی بیوی اسے جگاتی ہے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔
"کیا ہوا؟ —— خیر تو ہے؟"
"چھ بج رہے ہیں اب اٹھ جائیے۔"
"اوہ۔ میں سمجھا —— پھر کوئی بری خبر؟"
وہ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ پھر کہتا ہے۔
"روز کہتا ہوں نیک بخت —— مجھے اس طرح نہ جگایا کرو۔"
"آپ تو یوں ہی بدک جاتے ہیں" اس کی بیوی باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہتی ہے۔ "پتہ نہیں ہر وقت کیا ڈراؤنے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔"
خواب؟ وہ خود سے سوال کرتا ہے تو کیا یہ سب خواب تھا —— مگر کیسا بھیانک، طویل اور مکروہ خواب!
ہاں ہاں! یہ خواب ہی تو تھا۔
رضائی میں لیٹے لیٹے وہ دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اس کی بیوی نے بتایا ہے کہ چھ بج گئے ہیں مگر ابھی چھ بجنے میں دو منٹ باقی ہیں۔ چھوٹی سوئی چھ کے ہندسے کو چھو رہی ہے مگر ابھی چھ نہیں بجے —— یہ چھ اس وقت تک نہیں بج سکتے جب تک بڑی سوئی بارہ کے نقطے کو نہ چھولے۔ مگر یہ بڑی —— صرف

نام کی بڑی ہے اسے بڑی پر ترس آنے لگتا ہے جو دائرے کا پورا چکر کاٹ کر آتی ہے چھوٹی نے اس کے مقابلے میں بارھواں حصّہ سفر طے کیا ہے لیکن ابھی ابھی جب گھنٹے بجیں گے تو اس کا سہرا چھوٹی کے سر ہوگا۔

چھ بجتے ہیں!

وہ ساتھ ساتھ گنتا جاتا ہے، اسے معلوم ہے کہ جب چھوٹی چھ پر اور بڑی بارہ پر ہے تو چھ ہی بجیں گے۔ لیکن پھر بھی اسے شک ہے کہ کیا خبر گھڑی میں کوئی خرابی ہو گئی ہو اور آج وہ پانچ یا سات بجادے۔ چھ تک گنتی ہونے کے بعد وہ اطمینان کا سانس لینا چاہتا ہے کہ اس کی نظر روشن دان پر لگے ہوئے خاکی رنگ کے کاغذوں پر پڑتی ہے ان کے کھرچے ہوئے کاغذوں کو دیکھ کر اسے بلیک آؤٹ یاد آتا ہے۔ پھر اس کے کان میں سائرن کی آواز گونجتی ہے۔

خندق ——— دھماکہ ——— خون ——— لاشیں ——— دھواں اور گھپ اندھیرا۔!

مگر یہ سب تو خواب تھا!

عجیب واہیات سا خواب۔

لیکن کہیں یہ خواب کی بجائے کوئی حقیقت نہ ہو کہ ہم ہار گئے ——— اس کا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ خدا کرے یہ خواب ہی ہو ——— خواب کی کرچیاں اس کے دل کو لہو لہان کرنے لگتی ہیں۔

وہ بیوی کو بلا کر شک دور کرنا چاہتا ہے کہ گلی میں ہاکر کی آواز گونجتی ہے "اخبار اے" اس کا دھیان خواب کی باتوں سے ہٹ کر نیوز ایجنٹ اور اخبار کے مالک کی طرف چلا جاتا ہے۔ اسی لمحے اس کا بڑا بچہ اخبار لاکر سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ اخبار اٹھا کر دیکھنا چاہتا ہے لیکن کسی انجانے خوف سے اس کا ہاتھ لرز کر رہ جاتا ہے۔ پتہ نہیں آج کس ملک نے کس بڑی طاقت کے اشارے پر کس ملک پر حملہ کر دیا ہو؟

پتہ نہیں آج کس ملک کی فوج نے وہاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا ہو اور کیا

خبر وہ حکومت الٹے ہوئے تخت کو پھر سیدھا کر کے اس پر بیٹھ گئی ہو۔ یا ابھی تک تختے پر پڑی ہو۔

نہ جانے آج کہیں ہوائی جہاز، ریل گاڑی یا بس کا حادثہ ہو گیا ہو یا کہیں طوفان اور زلزلے کی وجہ سے ہزاروں انسان موت کی نیند سو گئے ہوں، کسی کارخانے میں آگ لگ گئی ہو یا کسی دکان کو لوٹ لیا گیا ہو۔ کسی کی بہو بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہو یا اغوا کر لی گئی ہو۔

نہ جانے آج کس وجہ سے بھائی نے بھائی کا خون کر دیا ہو۔ باپ نے بیٹے کو عاق کر دیا ہو۔

اور کیا پتہ جب وہ اخبار اٹھا کر دیکھے اس میں جنوری ۱۹۷۲ء کے بجائے کوئی اور تاریخ چھپ گئی ہو۔

مگر نہیں ——— وہ تو خواب تھا ——— طویل، بھیانک اور مکروہ خواب !

اسے شک دور کرنے کے لیے اخبار دیکھنا چاہیے۔

وہ اخبار دیکھتا ہے۔

اخبار میں سانپ لپٹا ہوا ہے۔ وہ چھیننا چاہتا ہے لیکن سانپ اس کے گلے کے گرد کنڈلی مار لیتا ہے اور اپنی دو شاخی زبان سے اس کا دماغ چاٹنے لگتا ہے۔ پھر اتر کر سیمنٹ کنکریٹ کے پکّے فرش میں گھس جاتا ہے۔

وہ اخبار کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ اخبار کورے کاغذوں کا پلندہ ہے اس پر کوئی سرخی، کوئی خبر، کوئی لفظ نہیں ہے۔ وہ گھبرا کر آنکھیں ملتا ہے کہیں وہ اچانک بصارت سے محروم نہ ہو گیا ہو۔

وہ اخبار سے منہ ڈھانپ لیتا ہے۔

اس کے کانوں میں لاکھوں سسکیوں، آہوں، چیخوں اور دھماکوں کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے۔ پھر پورے زور سے

چیخ کر کہتا ہے:

"ہاں، ہم ہار گئے، ہار گئے!"

اس کے ساتھ ہی اخبار کے اوراق پر آہستہ آہستہ الفاظ ابھرنے لگتے ہیں، سرخیاں، شہ سرخیاں، تصویریں، خبریں، کالم، کارٹون، نظمیں، اداریہ اور جنگی قیدیوں کی فہرست!

وہ خبروں کی سرخیاں یوں جلدی جلدی دیکھتا ہے جیسے بہت سے زخمیوں اور مرنے والوں میں اپنی لاش تلاش کر رہا ہو۔ دوسرے کمرے کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آتی ہے وہ اچھل پڑتا ہے اور چیخ کر کہتا ہے۔

"ہزار بار کہا ہے دروازہ آہستہ بند کیا کرو۔"

کچھ عرصے سے اچانک شور یا آہٹ سے اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگتا ہے۔ اس کے قریب سوکھا پتہ بھی گرے تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا ہے کہ اس کا دل ٹھیک ٹھاک ہے۔ البتہ اسے اپنے دماغ کو صاف رکھنا چاہیئے۔

دروازے پر کسی گداگر کی صدا گونجتی ہے "اللہ کے نام پر روٹی کا سوال ہے۔"

اس کی چھ سالہ بچّی منہ ہاتھ دھو کر جلدی جلدی آتی ہے اور باورچی خانے سے روٹی لے کر دروازے کی طرف جاتی ہے۔

وہ تڑپ کر بستر سے نکلتا ہے اور بھاگ کر دروازے کی طرف آتا ہے۔ گداگر ابھی تک بچّی سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کا حلیہ اور لباس بڑا پُر اسرار ہے۔ اس کے کندھے پر لمبے لمبے تھیلے لٹک رہے ہیں اور جیسے وہ ابھی ابھی بچّی کو کلوروفارم سنگھا کر اور اپنے تھیلے میں ڈال کر غائب ہو جائے گا۔ وہ لپک کر بچّی کو بازو سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لاتا ہے، پھر بیوی سے الجھ پڑتا ہے۔

"تمھیں یعقوب علی کی بچّی کے اغوا کا قصّہ بھول گیا ہے کیوں بچّی کو خیرات دینے کے لیے بھیجتی ہو۔"

نہادھو کر جب وہ ناشتہ کرنے بیٹھتا ہے پھر اخبار اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے۔

"بیوی نے شوہر کو کھانے میں زہر دے دیا۔"

ڈبل روٹی کا ٹکڑا اس کے منہ میں ہے لیکن وہ چبا نہیں سکتا۔ اسی لمحے اس کی بیوی اندر آتی ہے "آپ کھاتے کیوں نہیں؟"

اس کا شک یقین میں بدل جاتا ہے۔ وہ ناشتے کی چیزیں بیوی کے منہ پر دے مارنا چاہتا ہے لیکن پھر اسے ہنسی آجاتی ہے۔

اس کے دفتر جانے سے پہلے بچے اسکول چلے جاتے ہیں لیکن وہ اس کا ذہن بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ سکول کا راستہ بڑا خطرناک ہے۔ سڑکوں پر تانگوں، بسوں اور کاروں کا دریا بہتا ہے۔ اس نے کئی بار سوچا ہے کہ بچوں کو موٹر سائیکل پر خود سکول پہنچایا کرے۔ لیکن اسے خوف آتا ہے کسی بچے کی ٹانگ پہیے کے تاروں میں نہ پھنس جائے۔ موٹر سائیکل کسی بس یا ٹرک سے نہ ٹکرا جائے۔ ٹرک سے موٹر سائیکل ٹکرانے اور اپنے بچوں کے اعضاء سڑک پر بکھرنے کا تصور کر کے وہ کانپ جاتا ہے اور اب تو ڈاکٹر نے اسے موٹر سائیکل چلانے سے منع کر دیا ہے۔ وہ خود بھی کئی دنوں سے بس یا رکشہ سے دفتر جاتا ہے۔

دفتر جانے سے پہلے اسے قریبی دکان سے گوشت یا سبزی لانا ہوتی ہے۔ وہ لپک کر گوشت کی دکان پر پہنچتا ہے۔ اس نے ایک بار اخبار میں کتّوں کا گوشت فروخت ہونے کی خبر پڑھی تھی۔ دُنبے تو آسانی سے پہچانے جاتے ہیں مگر کھال اترے کتّوں اور بکروں میں تمیز کرنے کے لیے اسے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔

گھر سے نکلنے سے پہلے اس کی بیوی شاپنگ کے لیے اجازت مانگتی ہے وہ اجازت دے دیتا ہے لیکن اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ گلی کے موڑ پر وہ مُڑ کر حسرت بھری نگاہ اپنے مکان پر ڈالتا ہے۔ شاید وہ آخری بار اپنے گھر سے جا رہا ہو ——— کیا معلوم وہ جس بس میں سوار ہو وہ حادثے کا شکار ہو جائے جب اس کی لاش گھر لائی جائے اس کی ٹانگیں کٹ چکی ہوں۔ کھوپڑی کے دو حصّے

ہو گئے ہوں اور سڑک سے گھر تک کا سارا راستہ اس کے خون سے سرخ ہو گیا ہو، پھر اسے اپنے بچّوں، اپنی بیوہ، اپنے رشتہ داروں اور اپنی انشورنس پالیسی کا خیال آتا ہے۔ انشورنس پالیسی کا خیال آتے ہی وہ پریمیم، تنخواہ اور گھر کے اخراجات کا حساب کرنے لگتا ہے۔

جلد ہی اسے بس مل جاتی ہے لیکن وہ آدھ گھنٹہ دیر سے دفتر پہنچتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کا سپرنٹنڈنٹ اور بڑا صاحب بہت دیر سے دفتر آتے ہیں لیکن پھر بھی وہ خوف زدہ ہے کیا معلوم اس کی جواب طلبی کے لیے ان میں سے کوئی آج جلدی دفتر آگیا ہو۔

آفس ٹیبل پر بیٹھتے ہی اس کی نظر اپنے نام ایک خفیہ خط (Confidential Letter) پر پڑتی ہے اور جیسے کسی نے ملازمت کا دروازہ زور سے بند کر دیا ہو۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

کل وہ دو گھنٹے کی چھٹی لے کر ہسپتال گیا تھا مگر وہاں رش ہونے کی وجہ سے دفتری اوقات میں واپس نہیں آسکا تھا۔

پچھلے ہفتے اس کی میز سے ایک فائل چوری ہو گیا تھا۔

جنگ سے پہلے بڑے صاحب کا لڑکا ولایت سے لوٹا تھا تو وہ بیوی کی علالت کی وجہ سے بروقت مبارک باد دینے نہیں جا سکا تھا۔

پچھلے برس آڈٹ والوں نے اس کے حساب کتاب میں غلطیوں کی نشان دہی کی تھی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ خفیہ خط (Confidential Letter) کھولتا ہے۔ یہ اس کی ترقی کے لیے دی ہوئی درخواست کا جواب ہے۔

"فی الحال یہ ممکن نہیں۔"

اس کی جان میں جان آتی ہے۔ اسے یہ سوچ کر بے حد اطمینان ہوتا ہے کہ وہ خط اس کی جواب طلبی یا برطرفی کا نہیں ہے۔

بارہ بجے کے قریب اپنا گھر، بیوی اور بچّے یاد آتے ہیں۔

کسی بچّے کا سکول سے لوٹتے ہوئے ایکسیڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔
اس کی عدم موجودگی میں کوئی ناپسندیدہ رشتہ دار، مرد مہمان بن کر نہ آ گیا ہو۔
بیوی شاپنگ کر کے لوٹنے کی بجائے کسی کے ساتھ نہ چلی گئی ہو۔

اس کا جی چاہتا ہے دفتر سے چھٹی لے کر فوراً ہسپتال پہنچے جہاں اس کا حادثے میں زخمی ہونے والا بچّہ آخری سانس لے رہا ہے۔ لیکن فوراً ہی اسے خیال آتا ہے کہ اتنی دیر میں اس کی بیوی بھاگ جانے میں کامیاب ہو جائے گی اسے سب سے پہلے سٹیشن یا بس کے اڈے پر پہنچنا چاہیے۔

ڈاکٹر کی ہدایت یاد آتے ہی وہ اپنی خودساختہ پریشانیوں کو ذہن سے جھٹکنا چاہتا ہے کہ کنپٹی پر درد کی شدید ٹیس محسوس ہوتی ہے۔ کئی دن سے درد کی یہ لہر سر کے پچھلے حصے سے اٹھ کر کنپٹی اور بائیں آنکھ پر آ کر رک جاتی ہے۔ رضا صاحب کو بھی پہلے پہلے ایسی ہی شکایت تھی۔ بعد میں دماغ کی رگ پھٹنے سے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔
درد کی لہر تمام ہو جاتی ہے لیکن وہ اس درد سے اس قدر پریشان ہے کہ دو گھنٹے کی چھٹی لے کر ہسپتال کا رُخ کرتا ہے۔

ہسپتال کے راستے میں اسے بُرقع پوش عورت پر اپنی بیوی کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن دماغ کی رگ پھٹ جانے کے خوف سے وہ جلدی جلدی ہسپتال پہنچنا چاہتا ہے۔

ہسپتال سے سکون اور نیند کی گولیاں لے کر وہ سیدھا بازار چلا جاتا ہے۔ بچّوں کے ریڈی میڈ خوب صورت کپڑوں کی دکان دیکھ کر اسے اپنی بچّی یاد آتی ہے۔ وہ بچّی کے لیے ایک خوب صورت فراک پسند کرتا ہے لیکن پیسے دینے سے پہلے اسے خیال آتا ہے کہ کیوں نہ وہ گھر جا کر پہلے بچّی کی خیریت معلوم کر لے۔ وہ فراک چھوڑ کر سیدھا گھر پہنچتا ہے۔

بیوی کھانا لاتی ہے۔ بچّے سکول، کھیل، کتابوں اور امتحانوں کی باتیں کرتے ہیں اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب کبھی درد کی لہر اس کی کنپٹی تک نہ آئے گی۔

لیکن رات کو جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹتا ہے نظر نہ آنے والے اَن گنت زہریلے چیونٹے اس کے جسم سے چمٹ جاتے ہیں پھر اس کے جسم اور کھوپڑی میں سوراخ کر کے اندر گھس جاتے ہیں۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہتا ہے پھر خواب آور گولیاں کھالیتا ہے۔

اب اسے نیند آنے لگتی ہے لیکن وہ اس نیند سے بے حد خوف زدہ ہے۔ یہ موت ایسی نیند زبردستی اس پر مسلط ہوئی جاتی ہے وہ اٹھ کر بھاگنا اور گلا پھاڑ کر چیخنا چاہتا ہے۔" مجھے اس نیند سے بچاؤ"۔ مگر وہ حرکت نہیں کرسکتا۔ چیخ اس کے گلے میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ ایک دَم گھُٹنے والا گہرا دھواں اس کے چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔

اس کے دماغ میں توپ دغنے لگتی ہے۔" شکست —— شکست —— شکست"۔ دھواں گہرا ہو جاتا ہے۔ کلوروفارم کی سی بُو سے اس کا دم گھُٹنے لگتا ہے وہ دیکھتا ہے۔

اس کے دماغ کا آپریشن ہو رہا ہے۔

اس کے جسم کے سارے اعضا الگ الگ کر دیئے گئے ہیں۔ دونوں ٹانگیں مرجھائی مرجھائی کونے میں پڑی ہیں۔ دونوں بازو میز پر رکھے ہیں۔ اس کی کھوپڑی چیر کر اس میں سے موٹی موٹی گردنوں والے چیونٹے نکالے جا رہے ہیں وہ میز سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور خود بھی چیونٹوں کو چُن چُن کر نکالنا چاہتا ہے مگر اسے منع کر دیتا ہے۔ ٹرے میں اس کا دل پڑا دھڑک رہا ہے۔ قریب ہی ایک بوتل میں اس کی روح کلبلا رہی ہے۔ وہ بوتل کا ڈھکنا کھول دینا چاہتا ہے لیکن نرس بوتل چھین کر الماری میں بند کر دیتی ہے۔

اسی لمحے ڈاکٹر خوش ہو کر کہتا ہے۔

"یہ رہا درد"

ڈاکٹر درد کو چمٹی سے پکڑ کر اسے دکھاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا نوکیلا پتھر ہے۔

سیاہ ——— بھورا ——— یا شاید گہرے سبز رنگ کا۔

ڈاکٹر کہتا ہے۔

"یہ درد ہے ——— یہ تمھاری کھوپڑی سے نکلا ہے۔ آج کل جو ہوا چلتی ہے اس میں ایسے بہت سے باریک باریک ذرّات ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ کھوپڑی میں جمتے رہتے ہیں اور پھر درد کا نوکیلا پتھر بن جاتے ہیں تمھیں آئندہ احتیاطاً سانس نہیں لینی چاہیے۔"

اس کی بیوی اسے جگاتی ہے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

"کیا ہوا ——— خیر تو ہے ؟"

"چھ بج رہے ہیں اب اٹھ جایئے۔"

"اوہ ——— میں سمجھا شاید پھر کوئی بُری خبر..... ؟"

وہ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔

سانپ اور خوشبو

بچپن کی بہت سی ایسی یادیں ہیں جو آنسوؤں کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ غلام علی کے دل پر گرتی رہتی ہیں اور اس کا دل صابن کی گاچی کی طرح کھُرتا رہتا ہے۔

غلام علی ۲۵ - ۳۰ برس کا کڑیل جوان ہے لیکن ہر وقت ایک آٹھ دس سالہ ڈرپوک اور ندیدے سے لڑکے کی انگلی پکڑے رکھتا ہے۔ یہ ندیدہ اور ڈرپوک لڑکا اسے شہر کی گلیوں اور بازاروں میں لیے لیے پھرتا ہے۔ اس لڑکے نے بھوک اور پیاس کا ہوکا دیکھا ہے اور اب اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ غلام علی کو معقول تنخواہ ملتی ہے لیکن وہ ساری تنخواہ اس ندیدے لڑکے کی خاطر تواضع پر صرف کر دیتا ہے۔

غلام علی کو ایک ایسی خوشبو کی تلاش ہے جس کا نام وہ نہیں جانتا۔

صرف گامی اس خوشبو کو سونگھ سکتا ہے۔ گامی اس لڑکے کا نام ہے جس کی وہ انگلی پکڑے رکھتا ہے۔

گامی کے اندر ایک پانچ چھ برس کا بھولا بھالا سہما ہوا بچّہ ہے۔ اس بچّے کا نام بھی گامی ہے۔

گامی کی ایک ماں تھی ——— ہر آدمی کی ماں ضرور ہوتی ہے۔

گامی کی ماں کا نام ماں تھا ——— ہر ماں کا یہی نام ہوتا ہے۔

ہر ماں کی طرح گامی کی ماں بھی کہانیاں سنایا کرتی تھی ——— مگر بچّہ ٹوٹرو

کی کہانی گامی نے ماں سے اتنی بار سنی تھی کہ خود بچہ ٹوٹرو بن گیا تھا۔ جس کی ماں دانہ دنکا چگنے کہیں دور نکل گئی تھی اور اسے گھونسلے میں اکیلے بیٹھے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

بچہ ٹوٹرو کی کہانی بڑی اچھی تھی مگر اس کہانی کو سننے کے لیے بڑے کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا تھا اگر سردیوں کی کوئی یخ بستہ رات ہوتی تو بچہ ٹوٹرو کی کہانی سننے کے لیے نرم، گرم بستر سے نکل کر مکان کی کھلی چھت پر جانا پڑتا تھا۔

گامی نے ماں سے کبھی کہانی سنانے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ ماں کا جب جی چاہتا اسے بستر سے اٹھا لیتی اس کا سر منہ چومتی اور سردیوں کی تاریک رات یا گرمیوں کی شکر دوپہر میں چھت پر لے جاتی اس کا باپ گرمی ہو یا سردی چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹا رہتا۔ صرف کبھی کبھار کھانسنے لگتا۔

پہلے پہل ماں اسے سوتے یا جاگتے میں اٹھا کر لے جاتی تھی پھر وہ خود اٹھ کر ماں کے ساتھ چھت پر جانے لگا۔ وہ اسے اٹھانے، جگانے کے لیے ہاتھ لگاتی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور آنکھیں ملے بغیر ایک کل کی طرح آگے آگے سیڑھیاں چڑھنے لگتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سوتے میں ماں کا ہاتھ چھو جاتا تو وہ اٹھ کر سیڑھیاں چڑھنے لگتا۔ مگر پھر ماں کے قدموں کی چاپ نہ پاکر ٹھٹک جاتا۔ خوف سے اس کا دل دہل جاتا منہ سے چیخ نکل جاتی —— اس کی ماں گھبرائی اور بھاگی ہوئی آتی اور اسے واپس بستر میں لے جاتی۔

کبھی کبھی گرمیوں میں رات کو جب وہ چھت پر سو رہے ہوتے، وہ ماں کے اٹھنے کی آہٹ سن کر خود بخود اٹھ بیٹھتا اور آنکھیں ملے بغیر ماں کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اتر کر تھڑے پر آکر بیٹھ جاتا، تھڑے پر ان کے بیٹھنے کی جگہ مخصوص ہو چکی تھی —— تھڑے کے چاروں طرف مچھر بھنبھناتے —— ٹڈیاں بولتیں —— چوہے دوڑتے اور ہمسایوں کی بلی منڈیروں پر گھومتی رہتی حبس سے دم گھٹتا اور پسینے سے جسم شرابور ہو جاتے۔ مگر جب تک اس کے باپ کو کھانسی نہ آتی وہ دونوں تھڑے پر بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھی وہ ماں کے زانو پر سر رکھ کر

تھڑے کی کچی زمین پر سوجاتا وہ اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتی رہتی۔ لیکن باپ کے کھانسنے پر وہ یوں اچھل پڑتا جیسے کچی جماعت کا لڑکا چھٹی کی گھنٹی بجنے پر خوش ہو کر اچھلتا ہے۔

جب وہ دوبارہ چھت پر آتے اس کا باپ پہلو بدل کر چپ چاپ سو رہا ہوتا! چھت پر ہمسایوں کی بلی جس کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی تھیں، گھوم رہی ہوتی اور ایک ہلکی ہلکی خوشبو جو اسے بدبو کی طرح بری لگتی تھی چھت پر پھیلی ہوتی وہ اس خوشبو یا بدبو کو جس کا وہ نام نہیں جانتا تھا ——— پہچانتا تھا یہ اجنبی سی مانوس خوشبو یا بدبو بچہ ٹوٹرو کی کہانی کے آغاز اور انجام کی پہچان کا کام دیتی تھی۔

گرمیوں کی دوپہریں بڑی ویران، سنسان اور اداس ہوتی تھیں ہر طرف خاموشی ہوتی تھی صرف آٹا پیسنے کی چکّی کا گھگھو بولتا رہتا تھا جو ہر بات کا جواب ہاں ہاں یا نہیں نہیں میں دیتا تھا۔ سب بچّے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے وہ اکیلا گلی میں گھگھو کی آواز کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا ——— کبھی کبھی ماں اسے اندر بُلا لیتی تھی اور وہ اس کے ساتھ چمٹ کر سو جاتا تھا ——— لیکن پھر کبھی کبھی ——— اچانک وہی اجنبی مانوس خوشبو اس کے نتھنوں میں گھس آتی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ——— شاید اس خوشبو یا بدبو سے اس کی ماں کی نیند بھی خراب ہو جاتی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر سیڑھیاں چڑھنے لگتی تھی ——— گھر میں ایک ہی کمرہ تھا کوئی برامدہ یا درخت بھی نہ تھا۔ چھت پر لُو چلتی تھی۔ چھت کا کچا فرش توے کی طرح گرم ہوتا تھا ——— سورج سوا نیزے پر آکر چمکتا تھا ——— ماں اس پر دوپٹہ یا چادر ڈال دیتی تھی کبھی چارپائی کھڑی کر کے سایہ کرتی مگر دھوپ چارپائی کے بان کو جلا کر اور سوراخوں سے جھانک جھانک کر اس کے جسم میں سوئیاں چبھوتی رہتی تھی۔ ماں اسے دور جوہڑوں میں نہاتے ہوئے مویشی ——— سڑکوں پر آتے جاتے گدھے اور راستوں پر ناچتے بگولے دکھاتی وہ ان بگولوں اور واوروں کو دیکھ کر سہم جاتا اور جب کبھی یہ بگولے جن میں نظر نہ آنے والی بھتنیاں لڈی مارتی پھرتی تھیں قریب آجاتے تو اس کا

دل بیٹھنے لگتا اور وہ ماں سے چمٹ جاتا۔ لُو کے بلھوں کے ساتھ گدّ امارتی بھتنیاں جب تالیاں بجاتی اور چلی جاتیں تو اس کا سانس ٹھکانے آتا ماں اسے بہلانے کے لیے بچّہ ٹوٹرو کی کہانی سنانے لگتی۔

ایک تھی فاختہ ——— اللہ میاں کی فاختہ ——— ایک تھا اس کا ٹوٹرو دونوں وَن کے ایک پیڑ پر گھونسلے میں رہتے تھے ——— دونوں ایک دوسرے سے جدا ہونا نہ چاہتے تھے لیکن فاختہ کو اپنے اور ٹوٹرو کے لیے دانہ دُنکا چگنے باہر جانا پڑتا تھا۔ دونوں پیلو پکنے کا انتظار کرتے تھے۔ جب پیلو پکیں گے وہ ٹوٹرو کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جایا کرے گی۔ دونوں مزے سے بیٹھ کر پیلو کھایا کریں گے ——— لیکن ایک روز جب وہ چونچ میں ٹوٹرو کے لیے دانہ دنکا لے کر لوٹی تو اس نے دیکھا کہ اس کے ٹوٹرو کو کسی ظالم شکاری نے مار گرایا تھا۔ اس کے بعد فاختہ جہاں بیٹھتی ٹوٹرو کو یاد کر کے روتی اور جب بھی پیلو پکنے کی رُت آتی وہ پیڑوں کی شاخوں پر بیٹھ کر بیَن کرتی

بچہ ٹوٹرو ——— پیلو پکیاں ——— کھا نہ سکیاں

مارو نجائیوں ——— ہتھ نہ آئیوں ——— بچہ ٹوٹرو

کہانی سناتے سناتے ماں کی آواز بھرا جاتی لیکن پھر اچانک پتہ نہیں کیسے اسے یاد آجاتا اور وہ اسے لے کر نیچے آجاتی ——— اس کا باپ کروٹ بدلے ٹھنڈے اور اندھیرے کمرے میں سو رہا ہوتا اور اجنبی مانوس خوشبو یا بدبو ——— کمرے میں بکھری جاتی۔

گامی کو وہ بارش بھی یاد تھی جب وہ ماں کے ساتھ چھت پر بیٹھا بھیگ رہا تھا ——— بجلی چمکتی اور بادل گرجتے تھے۔ ماں کہانی سنا چکی تھی اور اب اسے بہتے ہوئے پرنالے اور بھاگتے ہوئے بادل دکھا دکھا کر بہلا رہی تھی اور بار بار اس کا منہ چوم رہی تھی۔

اسے سردیوں کی کئی اندھیری راتیں بھی یاد تھیں۔

——— وہ کھیس کی بکل مار کر اسے اپنے ساتھ چمٹا لیتی تھی۔ سردی سے اس کے دانت بجنے لگتے تو وہ اسے سینے سے لگا کر تھپکتی رہتی۔ پھر اسے کچھ دکھائی تو نہ دیتا مگر وہ سونگھ لیتا خوشبو کی لہر کمرے سے نکل کر باہر دروازے تک پھیل جاتی۔ اسی لمحے اس کے باپ کے کھانسنے کی آواز سنائی دیتی۔ اس کی ماں باہر کا دروازہ بند کرنے جاتی تو وہ بھاگ کر اپنے بستر میں آجاتا اور جب تک وہ لوٹتی وہ اس کے لیے بستر گرم کر چکا ہوتا۔

وہ سب راتیں اور باتیں بھول سکتا ہے لیکن بھادوں کی ایک گرم اور تاریک رات کا خیال آتے ہی اسے جھرجھری آجاتی ہے۔ وہ ابھی ابھی تھڑے پر آکر بیٹھے تھے کہ تھڑے کے نزدیک گز بھر لمبا سانپ رینگتا دکھائی دیا۔ خوف سے اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔ اس کی ماں کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکل گئی۔ وہ دونوں بھاگ کر سیڑھیاں چڑھنے لگے مگر پتہ نہیں کیوں اس کی ماں نے اسے سیڑھیوں میں روک لیا۔

" ابھی ہم اوپر نہیں جا سکتے۔"

" مگر نیچے سانپ ہے ماں۔"

" سانپ سیڑھیاں چڑھ سکتا ہے؟"

" سانپ کہاں نہیں ہے۔"

" چپ رہو۔"

وہ چپ ہو گیا ——— اچانک اسے خیال آیا کہیں چھت پر بھی سانپ نہ ہو پھر اس خیال سے کہ چھت پر ہمسایوں کی چمکتی آنکھوں والی بلّی ہے وہ مطمئن ہو گیا لیکن نیچے صحن میں جہاں سانپ تھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ اس کی ماں چھت کی طرف یوں پریشان ہو کر دیکھ رہی تھی جیسے چھت پر بھی سانپ رینگ رہا ہو۔ سانپ اس رات سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر نہ آیا لیکن اس کے بعد اکثر سوتے میں اس کے سینے پر چڑھ آتا اس کی چھاتی پر کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا اور اپنی دوشاخی زبان سے اس کا بھیجا چاٹنے لگتا۔

اس کے بعد جب وہ خوشبو یا بدبو سونگھتا۔ سانپ اس کی چھاتی پر کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا اور اس کا بھیجا چاٹنے لگتا، پھر جب سانپ اس کا بھیجا چاٹ کر چلا جاتا تو اس کی ماں کہتی اسے دورہ پڑا تھا۔

پھر وہ قریب کے قصبے میں پڑھنے جانے لگا۔

ماسٹر جی نے کہا تھا سکول آتے اور جاتے ہی ماں باپ کو سلام کیا کرو وہ سکول سے سیدھا گھر آ کر ماں کو سلام کرتا تھا۔ ماں کہیں گئی ہوتی تو وہ اسے سلام کرنے کے لیے مارا مارا پھرتا۔ ماں کہتی باپ کو بھی سلام کرو۔ ماسٹر جی بھی یہی کہتے تھے۔ وہ باپ کو سلام کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اس سے بے حد خوف آتا تھا۔ اس کا باپ سورج کی طرح خوف ناک اور بلند تھا۔

اس کی ماں زمین کی طرح مہربان تھی۔

وہ زمین پر بھاگ سکتا تھا، چھپ سکتا تھا، مٹی کے کھلونے بنا سکتا تھا۔

لیکن سورج کی طرف دیکھنے سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگتا تھا۔

گامی نے شیر نہیں دیکھا تھا مگر ابا سے اس کی دھاڑ سنی تھی۔

اس نے نیند کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا مگر اس کی مٹھاس کو پہچانتا تھا مگر جس طرح ہمسایوں کی بلی اندھیرے میں بھی چوہا پکڑ لیتی تھی اسی طرح وہ بھی آنکھیں بند کر کے اس خوشبو یا بدبو کو پہچان سکتا تھا۔

اس کی ماں اکثر اس کے ہاتھ عطر کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں منگاتی رہتی تھی، کبھی چار آنے، کبھی آٹھ آنے اور کبھی ایک روپے والی۔

وہ یہ پیسے لوگوں کا سوت کات کات کر کماتی تھی لیکن ہر بار عطر کی بھری ہوئی شیشی کو کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیتی تھی۔

پھر ایک بار ماں نے اسے ایک خالی شیشی دے کر ہدایت کی تھی کہ وہ دکان دار سے بالکل ایسی ہی شیشی خرید کر لائے۔ یہ خالی شیشی اس کی ماں نے روئی میں لپیٹ کر

اس کے بستے میں چھپادی تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ وہ اسے کھول کر نہ دیکھے دُکان دار خود کھول کر دیکھ لے گا لیکن اس نے ماں کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اسکول جاتے ہوئے خالی شیشی کو بستے سے نکالا اور روئی ہٹا کر خالی شیشی کو سونگھ لیا اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ وہ کب اور کیسے گھر پہنچا اور وہ خالی شیشی کہاں گئی۔ اس کی ماں نے بتایا تھا کہ اسے دورہ پڑا تھا وہ سڑک کے کنارے ایک کھڈ میں بے ہوش پڑا تھا کہ کسی راہ گیر نے اٹھا کر اسے گھر پہنچایا۔

گامی وہ خالی شیشی کھو بیٹھا۔ اگر وہ اسے نہ کھو دیتا تو شاید ماں خون تھوکنا شروع نہ کرتی۔

اسے خالی شیشی اور اس کی خوشبو سے بہت خوف آتا تھا لیکن ماں کے کملائے اور مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر وہ ہر روز سکول سے آتے جاتے شیشی تلاش کرنے کے لیے رک جاتا تھا۔

ماں خالی شیشی کے غم میں خون تھوکتی رہی۔ وہ بھی خوشبو کا نام نہ جانتی تھی سونگھ کر پہچان سکتی تھی۔

وہ کہیں آجا نہیں سکتی تھی۔ بستر پر پڑی کھانستی اور خون تھوکتی رہتی تھی۔ ہمسایوں کی بلی سارا دودھ پی جاتی تھی مگر وہ دودھ کا برتن نہیں ڈھانپتی تھی یا ڈھانپ نہیں سکتی تھی۔ اسے پیار بھی نہیں کرتی تھی دور رہنے کو کہتی تھی۔ ایک چھوٹی سی خالی شیشی گم کرنے پر اتنی سخت سزا دے رہی تھی گھر کا کام کاج پڑوسنیں کر کے دے جاتی تھیں۔ ماں صرف لیٹی رہتی تھی کبھی کبھی رونے لگتی تھی۔

پھر گھر میں اکثر مہمان عورتیں آنے لگیں، پھوپھیاں، چچیاں اور خالائیں، ایک جاتی ——— دوسری آجاتی۔

پھر ایک روز مدرسے میں گاؤں کا آدمی آیا اور بولا۔

"گامی گھر چل ——— تیری ماں تجھے بلاتی ہے"

ماسٹر جی نے فوراً چھٹی دے دی۔ وہ آدمی کے ساتھ گاؤں آرہا تھا۔ اس نے

راستے میں سوچا کیوں نہ ایک بار پھر تلاش کر کے دیکھ لے کیا پتہ خالی شیشی مل جائے۔
لیکن آدمی نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا۔ کیا پتہ خالی شیشی مل ہی جاتی۔
وہ گھر پہنچا ——— گھر میں بڑی رونق تھی۔

لوگوں کے درمیان اس کی ماں چارپائی پر چپ چاپ لیٹی تھی۔ آج اسے کھانسی کا دورہ نہیں پڑتا تھا۔ چہرے پر تکلیف کے آثار بھی نہیں تھے۔ وہ ہجوم کو چیرتا ہوا سیدھا اس کے پاس پہنچا اور سلام کیا ابھی ماں نے سلام کا جواب دینے کے لیے آنکھیں نہیں کھولی تھیں کہ لوگوں کے ہجوم میں اسے جانی پہچانی اجنبی خوشبو آئی اور اس کے منہ سے کف بہنے لگا۔

غلام علی کو گھر سے بھاگے پندرہ بیس برس ہو گئے ہیں لیکن اب بھی اسے خالی شیشی یا اس کی خوشبو کا نام جاننے کی شدید خواہش ہے۔ اسی لیے وہ ہر وقت گامی کی انگلی پکڑے رکھتا ہے۔ کئی بار راہ گیروں نے اسے ایمبولنس میں ہسپتال پہنچایا ہے۔

ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ خوشبو سے الرجک ہے۔ اسے ہر قسم کی خوشبو سے دور رہنا چاہیے لیکن غلام علی نہیں مانتا وہ کہتا ہے کہ خوشبوؤں کی اتنی قسمیں ہیں کہ انھیں گنا بھی نہیں جا سکتا۔ ایسی بھی خوشبوئیں ہیں جو اس کا ذہن سونگھتا رہتا ہے۔ دل محسوس کرتا رہتا ہے۔ یہ سب یادوں کی خوشبوئیں ہیں جو آنسوؤں کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ غلام علی کے دل پر گرتی رہتی ہیں اور اس کا دل صابن کی گاچی کی طرح کھُرتا رہتا ہے۔

تیرھواں کھمبا

گارڈ نے وسل دے دیا تھا اور سبز جھنڈی لہرا دی تھی جب ایک نوبیاہتا جوڑا اس کے سامنے کی سیٹوں پر آ کر بیٹھ گیا اسے ایسا لگا جیسے وہ آرام سیٹ پر نہیں بیٹھا۔ تپتی ہوئی ریل پٹڑی پر اوندھے منہ پڑا ہے۔

لڑکی اسے دیکھ کر یوں ہکّا بکّا رہ گئی جیسے وہ راولپنڈی جانے والی ریل کار کی بجائے ملتان جانے والی ریل کار میں سوار ہو گئی ہو۔

اس کے شوہر نے اپنے رومال سے اس کے لیے سیٹ صاف کرتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

"بیٹھو انجی۔"

"انجی ——— انجی ——— انجی۔"

اس پر چاروں طرف سے پتھر برسنے لگے۔ اس کا سارا بدن لہو لہان ہو گیا اسے ایسے لگا جیسے تیز رفتار ریل کار کا انجن اس کے اوپر سے گزر گیا ہو اور اس کے جسم کی بوٹیاں ہوا میں اڑ رہی ہوں۔ وہ اپنی سیٹ پر کھڑکی کی طرف منہ کر کے بیٹھا تھا لیکن ایک تیسری آنکھ اس کی کنپٹی پر اُگ آئی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی موجودگی سے وہ پریشان ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے اور منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا ہے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کہیں کوئی سیٹ خالی نظر

نہ آئی۔ اس قدر طویل سفر کھڑے ہو کر طے کرنا مشکل کام تھا وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے تہہ کیا ہوا اخبار نکالا جس کا ایک ایک لفظ وہ پہلے ہی پڑھ چکا تھا اور اپنے جسم کو اخبار کے اوراق کے پیچھے چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

ریل کار کے آہنی پہیے حرکت میں آئے وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی پلٹ کر اپنے شوہر سے باتیں کرنے لگی اور وہ ——— وہ بظاہر اخبار پڑھ رہا تھا مگر اس کے اندر کوئی طاقت ور انجن جلدی جلدی کانٹے بدل رہا تھا۔ اخبار چھوڑ کر اس نے کھڑکی کے باہر کے منظر میں پناہ لی ——— دور دور تک ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ریل کے خالی، فالتو اور بے کار ڈبے کونوں میں چپ چاپ کھڑے تھے اور کانٹے بدلتی فاصلے طے کرتی ہوئی ریل کار کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

ریل کی بے شمار پٹڑیاں دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اگر وہ ریلوے انجن ہوتا تو بوکھلا جاتا اور یقیناً کسی غلط پٹڑی کا انتخاب کر کے کسی دوسرے انجن سے ٹکرا جاتا۔ ٹکرانے کے خیال سے اسے لذّت ملی اور اس کا جی چاہنے لگا کہ کاش وہ واقعی کوئی طاقت ور انجن ہوتا جو کسی غلط پٹڑی پر دندناتا، شور مچاتا، چنگھاڑتا اور خس و خاشاک کو اپنے ساتھ اڑاتا کسی دوسرے انجن سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا۔ انجن کے نیچے آ کر کچلے جانے اور انجن بن کر کسی دوسرے انجن سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانے میں کتنا فرق تھا۔

ریل کار اب راوی عبور کر رہی تھی۔

بوٹنگ کرتے ہوئے لوگ نظر آئے تو اس نے تڑپ کر انجم کی طرف دیکھا، مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی وہ اپنے شوہر سے سرگوشیوں میں مصروف تھی۔

راوی کسی خوب صورت لمحے کی طرح گزر گیا ——— مگر اس کے دل میں دیر تک چپو چلتے رہے۔

اور ابھی وہ ایک سرد آہ بھی نہیں کھینچ سکا تھا کہ کھجوروں میں گھری ہوئی مقبروں

کی عمارتیں ایک حسین سپنے کی طرح دکھائی دینے لگیں۔ جہانگیر اور نور جہاں کے مقبرے قریب قریب تھے مگر ان میں ریل کی پٹریاں حائل ہو گئی تھیں۔ وہ زنجیر کھینچے بغیر تیز رفتار ریل کار سے اتر گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پانچ برسوں کا طویل سفر طے کرنے لگا۔

پانچ سال پہلے ایک شام مری میں اسے اس کا تار ملا تھا کہ فوراً لاہور پہنچو۔ اس نے لباس تبدیل کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ سخت پریشانی کے عالم میں وہ اسی وقت لاہور کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ جب وہ اگلی صبح خیبر میل سے اتر کر بغیر منہ ہاتھ دھوئے، بغیر ناشتہ کیے اور بغیر اپنے لباس سے گرد جھاڑے گرلز ہوسٹل پہنچا تو وہ اسے گیٹ کے قریب اپنی منتظر ملی۔ نوخیز کلی کی طرح ابھی ابھی چٹکی ہوئی نئی وضع کے خوش رنگ لباس میں جگمگاتی اور چھلکتی گنگناتی۔ وہ پریشان تھا اس نے اسے تار دے کر بلا لیا تھا۔ ایسی کیا بات تھی۔ خدا خیر کرے وہ راستہ بھر سوچتا اور دعائیں مانگتا آیا تھا۔ مگر جب اسے پتہ چلا کہ آج چھٹی تھی اور وہ اس کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے جانا چاہتی تھی تو اس کی ساری تھکن دور ہو گئی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ مری سے لاہور کا فاصلہ سمٹ کر ایک نقطہ بن گیا۔ راستے کی ساری گرد زرِ گل تھی اور بس اور ٹرین کا طویل اکتا دینے والا سفر پینگ کا ایک ہُلارا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنا شکن آلود لباس اور گرد سے اٹے ہوئے بال اسے اچھے لگ رہے تھے جیسے اس نے ہیرو کا رول فلم بند کرانے کے لیے میک اپ کر رکھا ہو —— اور سچ مچ وہ نگاہوں کے کیمرے سے اس کی تصویریں اتار رہی تھی۔ پھر جب وہ واپس مری چلا جائے گا تو تنہائی کے بند کمرے میں وہ اس فلم کو ڈب کرے گی اور سارے نیگیٹوز یادوں کی کسی ایسی الماری میں چھپا دے گی کہ وہ لاکھ سر پٹختا رہے کبھی اس کے ہاتھ نہ آئیں گے۔

وہ حیران تھا وہ ایکا ایکی اس پر اس قدر مہربان کیسے ہو گئی تھی وہ تو ہمیشہ ہر تصویر اس سے چھپا کر رکھتی تھی پھر آج ؟ —— شاید وہ اب تک اسے

آزمارہی تھی۔ شاید آج وہ اس کانٹے کا بھی ذکر کردے جو اسے اندر ہی اندر لہولہان کرتا رہتا تھا مگر وہ بظاہر ہنستی مسکراتی دکھائی دیتی تھی۔ کوئی انجانا سا اندیشہ اسے خوشی کے لمحوں میں بھی اداس رکھتا تھا۔ مگر وہ کچھ نہ بتاتی تھی۔ پوچھنے پر ہنسنے لگتی تھی۔

ہوٹل میں چائے کی میز سے اٹھ کر وہ باتھ روم چلا گیا ہاتھ منہ دھویا، بال درست کیے اور پھر اس کے ساتھ مل کر ناشتہ کیا وہ خوشی سے کھلی جارہی تھی۔

مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔

میرا اندیشہ تھا تم خیبر میل سے پہنچو گے۔

مجھے معلوم تھا کہ تم ناشتہ میرے ساتھ مل کر کرو گے۔

مَیں جانتی تھی تم گاڑی سے اتر کر سیدھے میرے پاس آؤ گے۔

مَیں جانتی تھی ——— مجھے معلوم تھا ——— مجھے یقین تھا۔

مَیں جانتی تھی ——— میں جانتی تھی ——— میں جانتی تھی۔

"تم نہیں جانتی ہو انجی ——— میں نے ولایت میں اتنا عرصہ کیسے گزارا۔" اس کے شوہر نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔ مَیں جانتی ہوں۔" وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

ریل کار بھاگتی جارہی تھی، مڑ کر نہیں دیکھتی تھی۔ مڑ کر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس کا جی چاہا اپنے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹ کر دیکھے کہ کہیں اس کا جسم سن تو نہیں ہوگیا۔ اس نے دانتوں سے اپنا ہاتھ کاٹنے کے لیے ہاتھ کو تلاش کیا مگر اس کے دونوں ہاتھ کٹ چکے تھے پھر اس نے دیکھا اس کی دونوں ٹانگیں بھی نہیں تھیں۔ اس نے گھبرا کر اپنے جسم کو تلاش کیا مگر وہ سیٹ جو اس نے اپنے لیے ریزرو کروائی تھی۔ اب خالی پڑی تھی۔ اسی لمحے اس کے کہیں قریب ہی کوئی کلی چٹکی ——— جانی پہچانی مہک کا ہلکا سا جھونکا آیا اور وہ یہ جان کر مطمئن ہوگیا کہ وہ جسم کے بغیر بھی سونگھ سکتا ہے۔

پھر سونے کی چوڑیوں کی سرد سرد سی کھنک سنائی دی ۔ اس کا مطلب ہے وہ سن بھی سکتا ہے ۔ ہاں وہ سونگھ سکتا ہے، سوچ سکتا ہے، رو سکتا ہے اور گا سکتا ہے !

وہ گانے لگا۔

" ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں، میینوں لے چلے بابلا لے چلے وے "

وہ گاتا رہا ——— درخت گاؤں کچے پکے راستے، فصلیں، تالاب اور ریلوے اسٹیشن ایک ایک کر کے گزرتے رہے، ہیر وارث شاہ سے اسے بہت سے بند یاد تھے۔ ایک بند ختم ہوا تو اس نے دوسرا بند شروع کر دیا۔

" وارث رن فقیر، تلوار، گھوڑا چارے تھوک ایہہ کسے دے یار ناہیں "

اس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ اس کی آواز میں بڑا سوز اور درد تھا۔ مگر پورے ڈبے میں کسی نے اس کے گانے کی طرف توجہ نہیں دی شاید سب لوگ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھے تھے۔ وہ دونوں برابر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اس کے گانے سے ذرا ڈسٹرب نہیں ہوئے وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا دل بیٹھ گیا اور کان کھڑے ہو گئے۔

کہیں مڈل ایسٹ اور ویت نام پر، کہیں روس اور امریکہ پر اور کہیں سوشلزم پر بحث ہو رہی تھی، کہیں ہنی مون اور مری کے مناظر کا ذکر ہو رہا تھا، اسے ڈائننگ کار کے بیرے پر بڑا ترس آیا۔ اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اس کا جی چاہا ڈائننگ کار کے بیرے کو اپنے پاس بٹھا کر اسے ہیر وارث کے اشعار سنائے۔ اسی وقت مری، سوات اور ہنی مون کے الفاظ کا شور اس قدر پھیل گیا کہ مڈل ایسٹ، ویت نام، روس، امریکہ، سوشلزم اور ڈائننگ کار کے بیرے کی آواز سب کچھ دب کر رہ گیا۔ اس نے اس شور سے بچنے کے لیے کانوں میں گاڑی کے پہیوں کا شور بھر لیا۔ اور ٹیلی فون لائن کے کھمبے گننے لگا۔ ابھی وہ بارھویں کھمبے تک گن سکا تھا کہ دو ایک کھمبوں کا گھپلا ہو گیا۔ نہ جانے یہ تیرھواں کھمبا تھا یا چودھواں۔

وہ اسی الجھن میں تھا کہ دو ایک کھمبے اور گزر گئے۔ اب جو کھمبا سامنے تھا خدا جانے یہ سولھواں تھا یا سترھواں۔ اگر چودھواں دراصل تیرھواں تھا تو یہ پندرھواں یا پھر سولھواں کھمبا تھا۔ مگر پندرھواں تو دراصل چودھواں تھا اور چودھواں، چودھواں کہاں تھا وہ تو اصل میں تیرھواں تھا اس لحاظ سے ——— ؟

"میری صرف پندرہ چھٹیاں رہ گئی ہیں انجی۔"

تو اس لحاظ سے بیسواں دراصل پندرھواں نہیں انیسواں ہوا اور سولھواں تو اس نے بالکل غلط گنا تھا۔ وہ اصل میں پندرھواں تھا۔ دراصل کھمبے پندرہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ ہر پندرہ کھمبوں کے بعد پھر پہلا کھمبا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ کُل کھمبوں کو گن کر پندرہ پر تقسیم بھی تو کر سکتا ہے۔ اسے یاد آیا اس نے بچپن میں بہت سی چیزیں گنی تھیں۔ ستاروں کی تعداد تو اب اسے یاد نہیں آ رہی تھی لیکن ایک میل میں شاید سترہ کھمبے تھے۔ اس نے سترہ کھمبوں سے ایک سو پچھتر میلوں کو ضرب دی۔ دس میل لمبی اس ضرب میں بہت سی چیزیں شامل ہو گئیں۔

درخت، فصلیں، پیدل جاتے ہوئے دیہاتی آدمی، کھیتوں میں چرتے ہوئے مویشی بستی کو لوٹتے ہوئے۔ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور ریلوے لائن کے متوازی جاتی ہوئی شاہراہِ اعظم کی بسیں، ٹرک، کاریں، بیل گاڑیاں اور شیشم کے درخت، اس حساب سے نہ جانے کتنی بھیڑیں، کتنے ٹرک، کتنے درخت اور کتنے کھمبے حاصل ضرب تھا اور نہ جانے اس حاصل ضرب کو پندرہ میلوں پر تقسیم کرنا تھا یا پندرہ بکریوں پر۔ مگر وہ تو کھمبے گن رہا تھا بارہ کھمبے اس نے ٹھیک طرح سے گن لیے تھے۔ تیرھویں کھمبے کا گھپلا ہو گیا تھا۔ اسے شمار میں نہ آسکنے والا کھمبا یاد آیا بے چارہ تیرھواں کھمبا۔ بارہ برس بعد تو بن باس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ تیرھواں کھمبا گنتی سے کیسے رہ گیا پتہ نہیں کس ویران جگہ پر کس قدر اداس کھڑا ہو گا۔ پھر اسے تیرہ کی کہاوتیں یاد آئیں۔

"نہ تین میں نہ تیرہ میں"

"نو نقد نہ تیرہ ادھار۔"

"چناب آ گیا انجی۔" اس کے شوہر نے کہا" اور چائے بھی، چکن سلائس اور شامی کباب۔"

"اونہہ یہ کیسی باس ہے میں نہیں کھاتی۔"

"بھئی مچھلی کے کباب ہیں آج گوشت کا ناغہ ہے نا۔"

"بڑی خراب سی بو ہے شاید باسی مچھلی کے ہیں۔"

اس کی ران میں درد ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا چیری ہوئی ران سے ساری پٹیاں اتار کر اسے دکھائے اور کہے:

"طوفان کی وجہ سے مجھے آج کوئی مچھلی نہ ملی اور میں نے اپنی ران چیر کر تمھارے لیے کباب تلے مگر تمھیں بُو آتی ہے تم اسے باسی کہتی ہو۔"

مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔

وہ چکن سلائس کھاتی رہی اور چائے پیتی رہی، اس کے شوہر نے کہا

"ہاں انجی مجھے بھی ستار بہت پسند ہے میرا ایک دوست خوب بجاتا ہے کبھی سنیں گے۔"

اس نے ریل کار میں بیٹھے بیٹھے ٹیلی فون لائن کے کھمبے اکھاڑے۔ پھر ان کو آگے پیچھے کر کے اس طرح گاڑا کہ ڈھیلے ڈھالے تار تن گئے۔ پھر وہ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر ستار بجانے لگا ستار بجاتے بجاتے اس کی انگلیاں لہو لہان ہو گئیں۔ گجرات سے جہلم تک ٹیلی فون لائن کے سارے تار سرخ ہو گئے۔ مگر اسے کسی نے داد نہیں دی۔ جہلم ریلوے اسٹیشن پر ریل کار رکی تو اس کا شوہر کسی کام سے نیچے اتر گیا۔ اس کا جی چاہا وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف اتر جائے اور اسے واپس لے جا کر وہ سارے تار دکھائے۔ جو سرخ ہو گئے تھے۔ پھر وہ دونوں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بکھرے ہوئے وارث شاہ کے مصرعے چنیں اور گنتی میں نہ آ سکنے والے تنہا اداس اور ویران کھمبے سے جا کر لپٹ جائیں اور اتنا روئیں کہ اس کھمبے کے چاروں طرف اور کچھ نہیں تو گھاس ہی اگنے لگے۔ پھر اس نے چاہا کہ وہ کوئی تڑپا دینے اور

دل جلا دینے والا مکالمہ بولے جیسے فلموں کے۔ ولین بولتے ہیں مگر وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔
وہ برابر اس دروازے کی طرف دیکھتی جا رہی تھی جس دروازے سے اس کا شوہر پلیٹ فارم پر اترا تھا۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ اس لڑکی کو بالکل نہیں جانتا۔

اس کا شوہر آیا تو وہ الجھ پڑی "اتنی دیر لگا دی آپ نے؟"

"اوہ انجی ——— تم تو بچوں کی طرح پریشان ہو جاتی ہو"

شام گہری ہو گئی تھی۔

وہ کھڑکی کے شیشے میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے پس منظر میں ٹنڈ منڈ درخت، اداس کھمبے اور خشک پہاڑیاں تھیں۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور جس قدر اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا کھڑکی کے شیشے میں اس کی تصویر واضح ہوتی جا رہی تھی۔ مگر وہ اس اندھیرے سے سہمی جا رہی تھی جیسے اس کے آس پاس انسان نہیں بدصورت چڑیلیں شور مچا رہی ہوں۔ وقت ایک سیاہ عفریت کی طرح اس کے چہرے کے پس منظر میں ساتھ ساتھ بھاگا جا رہا تھا۔ وہ خود بھی خوف زدہ سا ہو گیا۔ کھڑکی کے شیشے میں وہ یہ تصویر دیکھنا نہیں چاہتا تھا وہ یہ تصویر دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے سیٹ چھوڑ دی اور دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس طرف دونوں کی پیٹھ تھی۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر اسے یقین تھا کہ سامنے کی سیٹ خالی ہوتے ہی اس نے اپنے مہندی سے رچے ہوئے پاؤں اس سیٹ پر رکھ لیے ہوں گے اور اطمینان کا گہرا سانس لے کر باتوں میں لگ گئی ہوگی۔ اپنے وجود کی بے معنویت پر اس کا جی کڑھنے لگا اور اس کا جی چاہنے لگا کہ ریل کار سے کود کر سب لوگوں کو چونکا دے۔ مگر اسی لمحے ہوا کا ایک سرد جھونکا ادھ کھلے پٹ سے سسکتا ہوا اندر آیا اور اس سے لپٹ کر بولا

"باہر بڑا اندھیرا ہے۔"

اس نے دروازہ بند کرنا چاہا تو سرد ہوا کے کتنے ہی جھونکے دروازے پر دستکیں دینے لگے اس نے دروازہ پھر کھول دیا۔ ہوا کے جھونکے سسکتے ہوئے آتے اور

اس سے لپٹ جاتے تاریکی سے خوف زدہ ہو کر آنے والے ان جھونکوں کو اپنے جلتے ہوئے روشن بدن میں پناہ دے کر اسے بڑی راحت مل رہی تھی۔ اس نے اپنے بدن سے سگریٹ سلگایا، چنگاریاں اڑیں اور اپنے ہی سگریٹ کا دھواں اس کی آنکھوں میں گھس گیا۔ سرد ہوا کے جھونکوں کا سُوت اس کے جسم سے لپٹا جا رہا تھا اور ریل کار بے آب و گیاہ پہاڑیوں میں بھاگتی جا رہی تھی ہر طرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ کبھی کبھار کسی پہاڑی گاؤں میں کوئی دیا ٹمٹماتا نظر آجاتا تھا۔ ریل کار پوری تیزی سے اندھیرے کے عفریت کو کچلتی اور سیٹیاں بجاتی بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈبے میں شور اب بہت کم تھا۔ ہر شخص ہر بات سے اکتا کر اونگھ رہا تھا یا پھر تھکے تھکے لہجے میں ہمراہیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اچانک ریل کار ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ لوگ ایک دوسرے پر رگر پڑے۔

"کیا ہوا؟"

"سگنل نہیں ملا ہوگا۔"

"کوئی نیچے تو نہیں آگیا؟"

کسی کے نیچے آنے کی بات سن کر وہ لرز گئی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی "ہائے میں مر گئی ——— اس نے خودکشی کر لی۔"

"کس نے خودکشی کر لی اور تمھیں کیا ہوا انجی۔"

وہ تھر تھر کانپ رہی تھی سسک کر رہ گئی۔ اس کے شوہر نے پلٹ کر دیکھا وہ دروازے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور ہوا کے جھونکوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

راستے بند ہیں

وہ میلہ دیکھنے آیا ہوا ہے اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں

میں اس سے پوچھتا ہوں۔

"جب تمھاری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی تو تم میلہ دیکھنے کیوں آئے ہو؟"

وہ پہلے روتا اور پھر ہنستا ہے اور کہتا ہے۔

"میں میلے میں نہیں آیا —— میلہ خود میرے چاروں طرف لگ گیا ہے اور میں اس میں گھر گیا ہوں۔ میں نے باہر نکلنے کی کئی بار کوشش کی ہے مگر مجھے راستہ سجھائی نہیں دیا۔"

مجھے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لیے میں پریشان ہو جاتا ہوں کیوں کہ میں اس کی نگہداشت پر مامور ہوں۔ مجھے پتہ نہیں مجھے اس کی نگہداشت پر کس نے مامور کیا ہے؟ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ہر وقت اس کے ساتھ رہنا اور اُسے بھٹکنے سے بچانا ہے۔

میلہ زوروں پر ہے۔

چاروں طرف انسان ہی انسان نظر آتے ہیں جتنے لوگ میلے سے جاتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ آجاتے ہیں۔ سڑکوں پر ہر طرف تانگے، بیل گاڑیاں، بسیں، ٹرک، کاریں اور موٹر سائیکلیں ایک دوسری سے آگے نکلنے کی ناکام کوشش کرتیں۔ ہارن بجاتی، دھواں

اڑاتی نظر آتی ہیں۔ ہارن بجا بجا کر ڈرائیوروں کے اور مسلسل گھنٹیاں بجا بجا کر سائیکل سواروں کے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ پیدل چلنے والوں کے چہرے دھول سے اٹے ہوئے ہیں اور کپڑوں پر گرد جمی ہے لیکن میلے کے شور نے ان کے تھکے ہوئے نڈھال جسموں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ میلے کی فضا کو دھوئیں، گرد اور شور کے بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بڑے بڑے لاؤڈ سپیکروں پر انسانی آوازیں گرجتی اور چنگھاڑتی ہیں۔ جھولوں کی چیخیں، ڈھولوں کی گھمکاریں، مداریوں کی بانسریوں کی کوکیں اور خوانچہ فروشوں کی صدائیں ایک دوسری میں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ان سینکڑوں قسم کی آوازوں کے شور میں اسے سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی "ٹک" جیسی آواز سب سے اچھی لگتی ہے وہ اسے کسی سُریلے نغمے کی طرح سنتا اور چاٹتا ہے۔ میں نے کئی بار چلا چلا کر اسے آگے بڑھنے کے لیے کہا ہے مگر وہ سوڈا واٹر کی بوتلوں کی دُکان کے سامنے پتھر ہو گیا ہے۔ میرے لیے عجیب مشکل ہے۔ کاش میں اس سے علیحدہ ہو سکتا، اسے اس کے حال پر چھوڑ کر جا سکتا۔ میں اس کی کمینی حرکتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔ عجیب ندیدہ آدمی ہے۔ صبح وہ کتنی ہی دیر تک اس بھٹی کے قریب کھڑا جھلستا رہا جس پر پوریاں تلی جا رہی تھیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں، وہ بار بار جیب میں ہاتھ ڈالتا پھر خالی ہاتھ کو یوں گھورتا جیسے اس کی ہتھیلی پر گرم گرم پوری رکھی ہو۔ عجیب واہیات انسان ہے کھانا کھاتے ہوئے آدمی کے سامنے اکڑوں بیٹھے کتے کی آنکھ میں بھی اتنا ندیدہ پن نہیں ہوتا، جتنا حلوا پوری کھاتے اور فالودہ پیتے لوگوں کو دیکھ کر اس کی نگاہوں سے جھلکنے لگتا ہے۔

وہ میلہ دیکھنے آیا ہے۔

اور میلے میں دیکھنے کی سیکڑوں چیزیں ہیں۔ تھیٹر کے مسخرے، ناچتی گاتی عورتیں، سرکس کے جانوروں کے کرتب، موت کے کنوئیں میں چلتی موٹر سائیکل اور چلانے والے کی گود میں بیٹھی ہوئی لیڈی، اوپر نیچے جاتے جھولے، فلم ٹاکی پر دوگانے گاتے ہوئے عاشق معشوق اور مداری کے توپ چلاتے طوطے لیکن اسے ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی نہیں حالاں کہ سرکس کے باہر فلمی ریکارڈوں کی دھنوں پر ناچتے مسخروں کو دیکھنے پر تو

خرچ بھی کچھ نہیں آتا۔ مگر اسے صرف کھانے پینے کی چیزوں سے دلچسپی ہے۔ اسے پھلوں، مٹھائیوں، فالودوں، آئس کریموں، سوڈا واٹر کی بوتلوں اور سیخوں میں پروئے ہوئے مرغوں کو دیکھنا، گھورنا اور ان کی خوشبو سونگھنا اچھا لگتا ہے اور حالاں کہ دونوں وقت پیر صاحب کے ڈیرے پر اسے بھنڈارے کی دال روٹی مل جاتی ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ رات وہ مجھے دیر تک ان مٹھائیوں، پھلوں اور چیزوں کے نام گنواتا رہا جو اس نے کبھی نہیں چکھی تھیں۔ یہ فہرست اتنی طویل تھی کہ میں اکتا گیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ صرف ان چیزوں کے نام بتائے جن کے ذائقے سے وہ آشنا تھا۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لذیذ چیزوں کے ذکر سے حاصل ہونے والی لذّت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔

میلے میں اس کی جان پہچان کے اور لوگ بھی ہیں۔

الٰہی بخش نمبردار کا لڑکا عاشق ہے جو اپنے یار دوستوں کے ہمراہ اپنے یکّے پر آیا ہے اور اس کے ڈیرے پر ہر وقت مجرا ہوتا رہتا ہے اور شراب کی بوتلیں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ طوائفیں سروں پر رکھے اور دانتوں سے پکڑے ہوئے نوٹ چُن چُن کر تھک جاتی ہیں۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ وہ عاشق کے ڈیرے پر چلا جائے لیکن میں نے اسے منع کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں دن رات چلمیں بھرتا رہے۔ پھر سردار محمد تھانیدار ہے۔ اسے اعتباری آدمیوں کی ضرورت ہے لیکن میں نے اسے سردار محمد کے پاس جانے سے بھی منع کر دیا ہے۔ علیا نائی اپنے حال میں مست ہے۔ وہ میلے میں خالی ہاتھ نہیں آیا اپنے ساتھ رچھائی لیتا آیا ہے۔ اس کا جب جی چاہتا ہے حجامتیں بنانے لگتا ہے اور جب جی چاہتا ہے تھیٹر دیکھنے چلا جاتا ہے۔ تھیٹر دیکھتے ہوئے بھی وہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے ناخن تراشتا رہتا ہے۔ صرف مہرو سانسی ایک آدمی ہے جو اُسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور خوشی کے اظہار کے لیے جب بھی سامنے آتا ہے دانت نکالتا ہے یا پھر کالو ہے جو اُسے دیکھتے ہی دُم ہلانے لگتا ہے حالاں کہ اس نے زندگی بھر اُسے سوکھی روٹی کا ٹکڑا نہیں ڈالا۔

اسے مہرو سانسی اچھا لگتا ہے شاید اس لیے کہ مہرو گندی جھوٹی چیزیں سہی ہر طرح کی کھانے پینے کی چیزوں کے ذائقوں سے آشنا ہے۔ پچھلی بار تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ رات

کو جب اچانک آندھی آ گئی تو وہ کالو کے ساتھ پناہ لینے کے لیے ایک تخت پوش کے نیچے گھس گیا، تخت پوش کے نیچے قلاقند سے بھری کڑاہی رکھی تھی جسے اس نے اور کالو نے خالی کر دیا۔ اس دوران مہرو کو باہر نکل کر دو بار گلے میں انگلی ڈال کر قے کرنا پڑی تھی۔ اگر کالو کی دُم اس کے پاؤں کے نیچے نہ آجاتی تو ایک آدھ بار اور قے کر کے وہ گلاب جامنوں کا بھی صفایا کر دیتا۔ اسے مہرو اور کالو پر رشک آتا تھا اگر میں اس کے ہمراہ نہ ہوتا یا اس سے بے پروا ہو کر سویا رہتا تو وہ یقیناً بھٹک جاتا —— چلمیں بھرتا —— دلالی کرتا یا پھر کسی تخت پوش کے نیچے گھس کر قلاقند یا گلاب جامنیں کھا رہا ہوتا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی حلوائی کی دُکان یا کسی ہوٹل میں گھس کر جی بھر کے کھائے اور خود کو دُکان دار یا پولیس کے حوالے کر دے لیکن میں نے ہر لمحہ اُسے ایسی حرکتوں سے باز رکھا ہے۔

میلے کا آج تیسرا روز ہے۔

اور میں نہایت مشکل میں ہوں۔

وہ بغاوت پر آمادہ ہے۔

مجھے اس کے تیور بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی "ٹک" جیسی آواز سن کر اس کی تشفی نہیں ہوتی۔

وہ حلوہ پوری، قلاقند اور بالوشاہی کے ذکر سے مطمئن نہیں ہوتا۔

بھُنے ہوئے گوشت اور روسٹ مرغ کی خوشبو سے اس کا جی نہیں بہلتا اور وہ پھلوں کے نام گنوا کر لذت حاصل کرنے پر قناعت نہیں کرنا چاہتا۔

میں نے اسے بہت سمجھایا ہے، لعن طعن اور ملامت کی ہے لیکن وہ مصر ہے کہ وہ ہر قیمت پر ان سب چیزوں کو چکھ کر دیکھنا چاہتا ہے جن کے ذائقے سے وہ نا آشنا ہے۔

گزشتہ رات ہم دونوں دیر تک لڑتے جھگڑتے رہے ہیں میں نے اسے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو مجھے زندہ نہ دیکھے گا۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ اگر اس نے اپنی خواہش کا گلا نہ گھونٹ دیا تو گھٹ کر مر جائے گا۔

میں عجیب اُلجھن میں ہوں۔ شاید وہ وقت آگیا ہے جب ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم دونوں میں سے کسے زندہ رہنا چاہیے۔

میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

لیکن میں اسے بھی زندہ، خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس کی توجّہ ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اور اسے مداری کے کرتب، جھولوں کے مناظر اور مسخروں کے ناچ دکھانا چاہتا ہوں لیکن وہ قیمہ کریلے، بھُنے ہوئے گوشت، روسٹ مرغ اور قلاقند کے ذائقوں کے لیے قتل و غارت پر اُتر آیا ہے۔

وہ کہتا ہے "جب یہ سب چیزیں موجود ہیں تو ان کے ذائقوں سے محروم کیوں رہوں۔"
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اسے کیسے سمجھاؤں اور بھٹکنے سے کیسے بچاؤں؟
میلے کا آخری اور چوتھا روز ہے۔

رات مجھے ایک نہایت اچھوتا خیال سوجھا ہے اور میں نے بڑی مشکل سے یہ بات اس کے ذہن نشین کرائی ہے کہ اصل میں انسان ایک ہی انسان کا پَرتو ہیں یا اصل میں انسان ایک ہی ہے جو مختلف شکلوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ کہیں وہ قلاقند کھا رہا ہے، کہیں ناخن تراش رہا ہے، کہیں روسٹ مرغ اڑاتا ہے اور کہیں بھنڈارے کی دال روٹی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے یا کھایا پیا جا رہا ہے اس کی لذت انسان کی مشترکہ لذّت ہے۔ چناں چہ جب وہ کسی کو حلوہ پوری کھاتے دیکھتا ہے تو اسے محسوس کرنا چاہیے کہ خود حلوہ پوری کھا رہا ہے اور اس لذّت میں برابر کا شریک ہے۔

مجھے اس کی یہ عادت بے حد پسند آئی ہے کہ جب اس کے ذہن میں کوئی بات بٹھا دی جائے تو وہ اس سے سرِمُو اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ چناں چہ اس نے جلد ہی میری اس انوکھی تجویز پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

"ٹک" بوتل کھلنے کی آواز آتی ہے۔

ایک پتلا دُبلا آدمی بوتل منہ سے لگاتا ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مسکرا کر میری طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے:

" واہ وا ــــــــ کیا ٹھنڈی ٹھار اور مزے دار بوتل ہے ۔" پھر آستین سے منہ پونچھ کر کہتا ہے " مزا آگیا ۔" سیخ کبابوں کی خوشبو لپکتی ہوئی آتی ہے اور اس کے قدم روک لیتی ہے ۔

وہ منہ کھولے بغیر تکّوں کو دانتوں سے کاٹتا ہے چباتا ہے ۔ پھر ان کی لذّت محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے :

" ذرا سخت ہیں مگر گوشت سخت ہی تو مزا دیتا ہے ۔"

میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں ۔

اس کی نظریں بالوشاہی کے تھال پر ہیں ۔ وہ دُکان سے کچھ فاصلے پر کھڑے بالوشاہی کھانا شروع کر دیتا ہے ۔ کھاتے کھاتے اس کا منہ تھک جاتا ہے ۔ پیٹ پھول جاتا ہے مگر بالوشاہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی ۔ میں کہتا ہوں " اور کھاؤ ۔"

" نہیں بس " وہ ڈکار لیتے ہوئے جواب دیتا ہے ۔

پاپڑ دیکھ کر میں کہتا ہوں " منہ سلونا کرو گے ؟ "

" ہاں "

پاپڑ اس کے دانتوں تلے کڑکڑاتے ہیں ۔

" کیسے ہیں ؟ "

" بہت اچھے ہیں بس مصالحہ تیز ہے ۔"

" اور کیا پسند کرو گے ؟ "

" میں نے آج تک سیب نہیں چکھا ۔"

میں اسے پھلوں کی دُکان کے سامنے لے جاتا ہوں اور سیبوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں :

" یہ سیب ہیں تم جتنے چاہو کھا سکتے ہو ۔"

وہ ایک سیب نگاہوں سے اٹھاتا ہے دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے :

" یہ تو ناشپاتی ہے ۔"

"یہ ناشپاتی نہیں سیب ہے تم اسے سیب کی طرح محسوس کر کے کھاؤ۔"

وہ پھر دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے "یہ امرود ہے۔"

"یہ امرود نہیں سیب ہے۔"

وہ پھر کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے :

"یہ آڑو ہے۔"

"یہ آڑو نہیں ہے ——" مجھے غصہ آجاتا ہے "تم الّو کے پٹھے ہو۔"

وہ مجھے اداس نظروں سے دیکھتا ہے پھر روہانسا ہو کر کہتا ہے :

"مجھے کیا پتہ سیب کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے میں نے کبھی کھایا ہی نہیں۔"

"اچھا چھوڑو ——" میں کہتا ہوں "اب آگے چلتے ہیں۔"

ہم باری باری ایک دوسرے کی انگلی پکڑے چلنے لگتے ہیں۔ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔

"کیا بات ہے بھائی؟" —— وہ پوچھتا ہے۔

"حادثہ ہو گیا —— آدمی ٹرک کے نیچے آکر کچلا گیا ——"

وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھتا ہے —— پھر کہتا ہے :

"ٹرک! —— میرے اوپر سے ٹرک گزر رہا ہے! ——"

"نہیں ——" میں چلاّتا ہوں ——

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہوں وہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو جاتا ہے ——

کچّی پکّی قبریں

وہ اکیلا قبرستان کے ایک کونے میں اپنی آبائی جھونپڑی میں رہتا ہے۔

اسے قبرستان میں رہتے ہوئے کبھی ڈر نہیں لگا۔ وہ انہی قبروں کے درمیان کھیل کود کر بڑا ہوا ہے۔ وہ بچپن میں خود بھی چھوٹی چھوٹی قبریں بنا کر ننھے منّے مٹّی سے بنائے ہوئے مُردے کفنایا اور دفنایا کرتا تھا۔ اسے یہ جگہ جنّت کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے۔ نہر کی وجہ سے جھونپڑی کے قریب والے کنویں کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ قبرستان میں ہر طرف شیشم اور کیکر کے اونچے اونچے درخت ہیں جن کی چھال اور ٹہنیوں کی آگ سے چلم پہروں گرم رہتی ہے اور قبروں کے درمیان جا بجا بوٹی اُگی ہوئی ہے جس کے چند پیالے پی کر اسے عرش کے کنگرے نظر آنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا ہے ساری بُوٹی کاٹ اور پیس کر کنویں میں ڈال دے اور اس میں کود جائے۔ قبرستان میں اسے بہت آرام ہے۔ روحیں اس پر رُعب نہیں جماتیں، باز پُرس نہیں کرتیں اور مُردے اس سے بیگار نہیں لیتے۔

اسے کالو اور ڈبّو سے بڑی محبت ہے۔

اور اُسے اس بات پر بڑا فخر ہے کہ اس نے ان کے بے حد مناسب نام رکھے ہیں۔

کالو بالکل کالا ہے اور ڈبّو ڈب کھڑبا۔ لیکن اسے اپنا نام کچھ زیادہ پسند نہیں۔ جب وہ چھوٹا تھا تو اس کا نام کچھ اور تھا پھر جب چلتے وقت اس کے ٹخنے آپس میں ٹکرانے لگے تو اس کی ماں نے دھاگے میں پرو کر ایک کوڈی (کوڑی)، اس کے ٹخنے سے باندھ دی اور

اس کا نام گوڈو پڑ گیا۔

کالو اور ڈبّو ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے ہیں اور جب وہ بُوٹی پی کر قبروں کے درمیان گھاس پر یا جھونپڑی میں سوتا یا اُونگھتا ہے تو وہ اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس کا باپ بہت سخت تھا مگر اُسے اپنے باپ سے بھی محبت ہے۔ بُوٹی پیتے ہوئے اسے اکثر اپنا باپ یاد آجاتا ہے اور وہ بھنگ کے دو ایک پیالے اس کی قبر پر بھی انڈیل آتا ہے۔

جمعرات کے روز چودھری بخشے کے ہاں گُڑ کے میٹھے چاول پکتے ہیں جن کی خوشبو حویلی سے قبرستان تک پھیل جاتی ہے۔ وہ ہر روز صبح سویرے بھیک مانگنے کے لیے گاؤں جاتا ہے لیکن جمعرات کو تیسرے پہر مانگنے کے لیے نکلتا ہے اور کالو اور ڈبّو کو ساتھ لیے بھیک کے لمبے لمبے تھیلے لٹکائے گلی گلی گھومتا اور صدا لگاتا ہے۔

"جمعرات کا ایک دیہاڑا ہے مومنو۔ ساری نیک روحیں ثواب کی آس لے کر اپنے وارثوں کے دروازوں پر کھڑی ہیں۔ قبرستان کا فقیر گوڈو بھی آپ کے دروازے پر آیا ہے اور ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا ہے اور دعا دیتا ہے دھن بھاگ ہوں۔ آل اولاد کا صدقہ، مال و جان کی خیر، اونچے محل مناروں کی خیر۔"

سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ساری رُوحیں قطار اندر قطار قبرستان میں واپس آجاتی ہیں گوڈو ان سے پہلے قبرستان پہنچ جانا چاہتا ہے اسے ڈر رہتا ہے کہ جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی اس کے ماں باپ اور دادا کی روحیں مایوس ہو کر لوٹ نہ جائیں۔ ماں کو تو وہ گُڑ کے میٹھے چاولوں سے منا سکتا ہے لیکن اس کے باپ کی طرح اس کی روح بھی نہایت ضدی اور غصیلی ہوگی۔ دیر ہوگئی تو گالیاں بکتی اور پاؤں پٹختی واپس چلی جائے گی اور بُوٹی کے پیالوں سے بھی خوش نہیں ہوگی۔ دادا کی اسے زیادہ پروا نہیں۔ دراصل اس نے اپنے دادا کو دیکھا ہی نہیں ویسے بھی اسے بوڑھوں سے نفرت ہے سارا قبرستان ان سے پٹا پڑا ہے۔

جمعرات کو شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی چند پُختہ قبروں پر اگر بتّیاں سلگتی اور

سرسوں کے تیل کے دیئے جلتے نظر آنے لگتے ہیں۔ قرآن خوانی ہوتی ہے اور فاتحہ پڑھی جاتی ہے کھاتے پیتے سعادت مند بیٹے اپنے ماں باپ اور مالدار بیوائیں اپنے شوہروں کی قبروں پر آتی ہیں لوگ دیئے جلاکر اور کوڈو کو قبروں کی دیکھ بھال کی تاکید کرکے چلے جاتے ہیں تو کوڈو کے اندر کوئی چیز سلگنے لگتی ہے۔ کبھی کبھی اسے قبروں کے درمیان ٹیڑھے میڑھے راستوں پر گاؤں کی تنگ اور پُرپیچ گلیوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بڑے لوگوں کی قبریں پختہ اور بڑی ہیں غریب اور نادار لوگوں کی قبریں کچی اور بے نشان ہیں۔ زمینداروں اور چودھریوں کی پختہ قبریں ان کی حویلیوں کی طرح اچھی اور بلند جگہوں پر ہیں۔ دور ہی سے پہچانی جاسکتی ہیں اور ان میں سے بعض پر دِیئے جلانے کے لیے طاقچے بنے ہوئے ہیں اور سنگِ مرمر کی لوحیں نصب ہیں۔ مزارعوں اور کمی کمینوں کی قبریں نم آلود اور نشیبی جگہوں پر ہیں بعض پر لمبی لمبی گھاس اور بوٹی اگی ہوئی ہے اور بعض بالکل ہموار ہو چکی ہیں۔ ان کے وارث کام کاج میں پھنسے رہتے ہیں اور کبھی سال میں ایک بار محرّم کے مہینے میں آتے اور کوڈو کی نشان دہی پر قبروں کی شناخت کرتے اور روڑ مٹی ڈالتے۔

پہلے پہلے کوڈو کو پختہ قبروں کے طاقچوں میں جلتے ہوئے دِیئے اور اگربتیاں دیکھ کر اپنے ماں باپ کی مُفلسی اور بے کسی پر ترس آتا اور دُکھ ہوتا تھا مگر اب قبرستان میں اندھیرا پھیلتے اور لوگوں کے رُخصت ہوتے ہی وہ پختہ قبروں سے دیئے اٹھاکر اپنے ماں باپ کی قبروں پر رکھ دیتا ہے۔ ماں باپ کی قبروں پر جلتے ہوئے دیئے دیکھ کر اسے بڑا سکون ملتا ہے اور وہ اپنی اس سعادت مندی پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا ہے۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ پختہ قبروں سے اینٹیں نکال کر اپنے ماں باپ کی قبریں بھی پختہ بنادے لیکن اس طرح اسے پکڑے جانے، قبرستان سے نکال دیئے جانے اور خیرات بند ہو جانے کا ڈر ہے۔ ایک دفعہ اس نے اپنی ماں کی قبر پر شیشم کا پودا لگایا تھا تو چودھری فضل کے بڑے لڑکے نے مار مار کر اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے یہ پودا اس کے باپ کی قبر سے اکھاڑا تھا۔ حالاں کہ اس نے یہ پودا گاموں ترکھان کی قبر کے قریب سے کھودا تھا۔

رات کو قبرستان میں ٹڈیاں بولتی، مینڈک شور مچاتے اور سانپ شُوکتے ہیں۔ وہ بُوٹی پی کر چارپائی میں دھنسا حقّہ پیتا رہتا ہے۔ پھر جب کسی چرواہے کی بنسری کی دل چیر دینے والی آواز سنائی دیتی ہے تو وہ دُکھی ہو جاتا ہے اور اپنی بے سُری آواز میں گانے لگتا ہے:

"اچیاں محلے والیے پاوے خیر فقیراں نوں"

نوراں جب سے جوان ہوئی ہے گاؤں کے گبروؤں کا کام کاج میں جی نہیں لگتا۔ کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے اور چارہ کاٹتے ہوئے بھی ان کا دھیان گاؤں کی طرف لگا رہتا ہے۔ چرواہے اس کے فراق میں بنسریوں پر دردیلی دُھنیں الاپتے اور کسان ماہیے، ٹپّے اور ابیات گاتے ہیں:

؎ الف آپیا دیا لگ سینے

؎ اڈیاں نی کونجاں وچ اک سادی کونج اے

اور حالاں کہ وہ گھر سے باہر بہت کم نکلتی ہے اور چودھری بخشے کی حویلی میں پرندہ پَر نہیں مار سکتا مگر اس کے حسن و جمال کی دھوم بارہ بارہ کوس تک پھیل گئی ہے اس کے بے شمار عاشق اور پرستار پیدا ہو گئے ہیں اور بڑی دور دور سے اونچے گھرانوں کے رشتے آ رہے ہیں۔ کوڈو بھی اس کے پرستاروں میں سے ایک ہے۔ کہتے ہیں کہ جب یوسف علیہ السلام کا نیلام ہونے لگا جس کے پاس جو کچھ تھا لے دوڑا ایک بڑھیا سوت کی ایک انٹی لے کر آ گئی تھی۔

کوڈو فقیر سارے عاشقوں اور پرستاروں سے زیادہ خوش نصیب ہے وہ بھیک مانگنے کے لیے ہر روز چودھری بخشے کی حویلی میں جاتا اور نوراں کا دیدار کرتا ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد اس نے روزانہ گاؤں جانا اور مانگنا چھوڑ دیا تھا۔ صرف جمعرات کے روز جاتا تھا مگر جب سے عشق کی آگ سے اس کا اندر دہکنے لگا ہے اس نے پھر ہر روز جانا اور مانگنا شروع کر دیا ہے۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی اس کا جی مچلنے لگتا ہے کہ جلد از جلد چودھری بخشے کی حویلی کے دروازے پر پہنچ کر صدا لگائے مگر وہ اپنی خواہش کے

منہ زور گھوڑے کی لگامیں بار بار کھینچتا اور حساب لگاتا رہتا ہے کہ اب وہ دودھ بلو رہی ہوگی، اب وہ برتن دھو رہی ہوگی اور اب وہ روٹیاں پکا رہی ہوگی۔

کبھی کبھی اسے چودھری بخشے کی گلی میں داخل ہوتے وقت خوف سا آنے لگتا ہے اور وہ خود سے کہتا ہے۔ طوطیا، من موطیا، کوڈو فقیرا باز آ۔ اس گلی میں نہ جا۔ اس گلی کے لوگ ظالم ہیں تجھے پھاہی (پھندا) پالیں گے۔

اندھیری راتوں میں قبرستان میں خاموشی چھائی رہتی ہے اور ٹڈیوں کے بولنے، مینڈکوں کے ٹرّانے اور سانپوں کے شوکنے کی آوازیں بھی سنائی نہیں دیتیں تو اسے لگتا ہے کہ وہ بھی مر چکا ہے اور کسی کچی ٹوٹی ہوئی قبر میں بے حس و حرکت پڑا ہے لیکن کبھی کبھی چاندنی راتوں میں گھنگھروؤں کی جھنکار سن کر اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ کالو اور ڈبو تھڑے کی نم آلود جگہ پر لیٹے ہوئے اونگھ رہے ہوتے ہیں۔

اور قبرستان کے عین وسط میں الاؤ کے گرد بے کفن جوان عورتیں محو رقص ہوتی ہیں۔ ہوا کے جھونکے درختوں کی ٹہنیوں سے ٹکرا کر سارنگیاں بجاتے ہیں درختوں کے پتّے آپس میں ٹکرا کر تال دیتے ہیں اور اپنی اپنی قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تماشائی مُردے تالیاں بجا بجا کر داد دیتے ہیں اور وہ اپنے میلے بدن پر مچھروں کے کاٹنے کی جگہوں کو بے دردی سے کھجلاتا، کڑوے تمباکو کے گہرے کش لیتا اور رات رات بھر جھومتا رہتا ہے۔

دن کو وہ بُوٹی کے چند پیالے پی کر نہر کے کنارے جا بیٹھتا ہے اور اسے ہر چیز سبز نظر آنے لگتی ہے۔ نہر کا سبز رنگ کا پانی دیکھ کر اس کا جی چاہتا ہے کسی بڑے راجباہ کے موگھے کی طرح ٹیک لگا کر نہر کا سارا پانی پی جائے۔ وہ قریبی پُل کے نیچے سے بہتی ہوئی نہر کو دیکھتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے نہر کا پانی پُل کے نیچے سے نہیں بہہ رہا کسی دیو قامت کوڈو کے حلق میں اترتا جا رہا ہے۔ وہ پہروں نہر کے کنارے بیٹھا حقّہ پیتا اور خوبصورت خیالوں سے کھیلتا رہتا ہے۔

وہ ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار دیتی ہے اور نہر کے سبز رنگ کے پانی میں نہانے کے لیے اترتی ہے وہ کالو اور ڈبّو کو منہ دوسری طرف کر لینے کی ہدایت کرتا ہے لیکن

خود آنکھیں پھاڑے نہر کے اس پار اسے پانی میں اُترتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے وہ سنہری مچھلی کی طرح تیرتی ہوئی نہر کے وسط میں آجاتی ہے اور اپنا عُریاں بدن چھپانے کے لیے بار بار غوطہ لگاکر تہہ میں چلی جاتی ہے اور وہ اس کے اوپر آنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

بعض اوقات وہ کئی کئی روز تک اوپر نہیں آتی۔

ایک روز کیا دیکھتا ہے کہ چودھری بخشے کی حویلی مہمانوں سے بھری پڑی ہے۔ گھوڑے ہنہناتے اور شہنائیاں بجتی ہیں، دیگیں چڑھی ہیں اور کمّی کمین بھاگے دوڑے پھرتے ہیں۔ اسے چولہوں میں ایندھن جھونکنے کے لیے کہا جاتا ہے وہ آگے بڑھتا ہے لیکن ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ دیگوں کے نیچے بڑے بڑے چولہوں میں لکڑیوں کی جگہ دھڑا دھڑ اس کے بازو اور ٹانگیں جل رہی ہیں۔ گوشت جلنے کی بُو چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ کوڈو فقیرا، بدبختا تجھے منع نہیں کیا تھا کہ اس گلی میں نہ جا۔ اس گلی کے لوگ ظالم ہیں۔ !

کیا دیکھتا ہے کہ ٹوکے سے اس کی ہڈیاں کاٹی جارہی ہیں اور تیز چھریوں سے اس کی بوٹیاں چیری جارہی ہیں قریب ہی ایک لڑکا بیٹھا پیاز کتر رہا ہے وہ اپنی بوٹیوں کو ٹٹول کر دیکھتا ہے۔ یہ چانپ ہے، یہ گردن ہے اور یہ پٹھ !!

—— اسے پلاؤ میں ڈالا جائے گا۔

—— اس کا قورمہ پکایا جائے گا۔

—— وہ اسے دیگ میں ڈال کر اس کے منہ پر ڈھکنا رکھ دیں گے اور اس کا دم گھٹ جائے گا۔

گوڈو فقیرا۔ بدبختا !!

اس کی چمڑی ادھیڑ کر اس کی ڈھولک بنائی گئی ہے۔ ڈھولک پر جب بھی تھاپ پڑتی ہے اس کی چمڑی دُکھنے لگتی ہے۔ بے چارہ کوڈو فقیر، غریب، یتیم، بھک منگا، طوطیا۔ من موطیا۔ کوڈو فقیرا۔ بدبختا تجھے کہا تھا نا کہ اس گلی میں نہ جا۔ اس گلی کے لوگ بڑے ظالم ہیں تجھے پھاہی پالیں گے۔

گھوڑے ہنہناتے ہیں۔

شہنائیاں بجتی ہیں۔

اور نوراں کی ڈولی نکلتی ہے۔

"لے وے رانجھیا واہ میں لاء تھکی میرے دس نئیں گل بے دس ہوئی۔"

دولہا کا باپ ہجوم پر ریزگاری کا مینہ برساتا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا جسم سُن ہوجاتا ہے لیکن پھر سکے کوڈو کے بدن پر سنگریزوں کی طرح گرنے اور بچھوؤں کی طرح ڈسنے لگتے ہیں۔ وہ انھیں حقارت سے روندتا ہوا قبرستان کی طرف لپکتا ہے اور کدال اٹھا کر چودھری فضل اور نمبرداری روشن بی بی کی قبروں کی طرف بڑھتا ہے۔

اگلے روز اس کی آنکھ کھلتی ہے تو چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوتی ہے اس کے سیاہ اور میلے جسم پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں اس کے ہاتھ اور سر کے بال دھول سے اَٹے ہوئے ہیں اور تھکاوٹ سے اس کا بند بند درد کر رہا ہے۔ پھر اس کی نظر کدال پر پڑتی ہے۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ نوراں کی ڈولی نکلتے وقت جو کانٹا اسے لہولہان کر رہا تھا۔ اب اس کے دل سے نکل گیا ہے۔ اُسے یہ سوچ کر بڑی طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ اب اس کے ماں باپ کی قبروں پر ہر جمعرات کو فاتحہ اور قرآن خوانی ہوگی اور اگربتیاں سلگتی اور دیئے جلتے رہا کریں گے۔ خوشی اور فتح کے احساس سے اس کا سینہ تن جاتا ہے وہ بُوٹی کا پیالہ پیتا ہے پھر خود سے کہتا ہے "کوڈو فقیرا۔ فکر نہ کر بدبختا۔ کون کھود کر دیکھتا ہے اور دیکھ بھی لے تو کون پہچان سکتا ہے امیر اور فقیر سب کی کھوپڑیاں اور ہڈیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔"

پانی میں گھِرا ہوا پانی

چکنی مٹّی سے گھوڑے، بیل اور بندر بناتے بناتے اس نے ایک روز آدمی بنایا اور اسے سوکھنے کے لیے دھوپ میں رکھ دیا ——

سَخت دوپہر تھی، چلچلاتی دھوپ کے شعلے ویران اور کلّر زدہ زمین پر جگہ جگہ رقص کر رہے تھے، چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ چرند پرند پناہ گاہوں میں چھپ گئے تھے۔ شرینہہ کا بوڑھا پیڑ چپ چاپ دھوپ میں کھڑا جُھلس رہا تھا اور زیناں اب تک روٹی لے کر نہیں آئی تھی۔

اس نے گاؤں کی طرف سے آنے والے راستے پر دور دور تک دیکھا مگر چلچلاتی دھوپ کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا، اس نے چلم کو ٹٹولا وہ گرم تھی، مگر اس نے کش لیا تو اس کے منھ میں جلے ہوئے تمباکو کی بُو کے سوا کچھ نہ آیا —— وہ اٹھ کر سائے میں آ گیا اور زیناں کی راہ دیکھنے لگا۔

ایک مدّت سے اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسا باوا بنائے جسے کم از کم زیناں دیکھ کر ضرور دنگ رہ جائے اور اس کی کاریگری کی تعریف کرے۔ اس کے ذہن میں جوانی کے دنوں سے ایسے بہت سے لوگوں کی شکلیں اور قامتیں محفوظ تھیں جن سے وہ کبھی نہ کبھی متاثر ہوا تھا وہ چاہتا تھا دیکھے ہوئے ان بہت سے چہروں اور جسموں کو توڑ کر ان کے خمیر سے ایک نہایت عمدہ قدوقامت اور چہرے مہرے والا آدمی بنائے جو ہر طرح سے مکمّل اور نادر ہو،

اس نے اپنے ذہن میں اسے کئی بار مکمل کیا تھا مگر بار بار اس کی شکل وصورت اور ساخت اس کے ذہن سے اُتر جاتی یا دھندلا جاتی۔ وہ اسے مکمل یکسوئی اور اطمینان سے بنانا چاہتا تھا لیکن اطمینان نصیب نہیں ہوتا تھا اسے ہر گھڑی زیناں کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کئی ایک بار اس نے کوشش بھی کی مگر پھر اسے ادھورا چھوڑ دیا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ اسے اس وقت یاد آتا جب مٹی کم ہوتی یا اچھی نہ ہوتی اور کبھی اس وقت جب وہ رات کو کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر لیٹ کر حقہ گڑگڑا رہا ہوتا۔ مگر آج گھوڑے، بندر اور بیل بناتے بناتے اچانک اس کے دل میں درد زہ کی سی ٹیس اٹھی اور اس نے اسے بنایا اور سوکھنے کے لیے دھوپ میں رکھ دیا۔

بیٹھے بیٹھے اس نے شرینہہ کی سوکھی ہوئی پھلی لے کر مروڑی اور بیج نکال کر گننے لگا، اسے خیال آیا کہ بوڑھے شرینہہ کے سوکھنے یا ٹوٹ جانے سے پہلے دوسرا شرینہہ اگا دینا چاہیئے لیکن پھر وہ کسی انجانے خیال سے اداس ہوگیا۔ اسی لمحے زیناں روٹی لے کر آگئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اطمینان کا سانس لیا پھر گھڑے سے پانی کا پیالہ بھرا اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔ زیناں اس کے سامنے بیٹھ کر دوپٹے کے پلّو سے پنکھا کرنے اور نظر نہ آنے والی مکھیاں اڑانے لگی پھر بولی:

"تمباکو نہیں ملا —— دُکان والا پچھلے پیسے مانگ رہا تھا —— تم کہو تو مجھ سے کچھ ——"!

"نہیں" اس نے چھاچھ کا پیالہ خالی کر کے رکھتے ہوئے کہا "میں شام کو آکر خود اس سے بات کر لوں گا —— فی الحال ایک آدھ چلم ہے —— کام چل جائے گا"

"میں تو کہتی ہوں" زیناں شرینہہ کی ڈالیوں سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ کو ہاتھ کی پشت پر روک کر بولی "دوپہر کو گھر آجایا کرو —— درخت بوڑھا ہوگیا ہے اور لوگوں نے اس کی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر اسے اور بھی ٹنڈ منڈ کر دیا ہے۔"

"یہ بڑا برکت والا ہے۔" اس نے کہا "یہ نہ ہوتا تو بدھائی مانگنے والوں کو گھر تلاش کرنے میں دقّت پیش آتی، سارے گاؤں میں یہی تو ایک شرینہہ ہے۔"

وہ روٹی کھا چکا تو وہ برتن سمیٹنے لگی۔ اسے اچانک کچھ یاد آیا وہ بے قراری سے بولا "زیناں، میں نے آج ایک کمال کی چیز بنائی ہے۔"

"کیا؟"

"بوجھو تو؟"

"مرتبان" وہ بولی "تم نے اچھا کیا جب بھی لسّی مانگنے جاتی ہوں چودھرائن مرتبان کا ضرور پوچھتی ہے۔"

"وہ بھی بنا دوں گا، لیکن یہ ایک دوسری چیز ہے۔"

"اچھا اچھا"، وہ ہنس پڑی "مجھے پتہ چل گیا، جھانواں"

وہ بھی ہنس پڑا کہنے لگا "جھانواں" تو نہیں پر ایک لحاظ سے جھانواں ہی سمجھو کیوں کہ اس میں عقل تمیز نہیں ہے ——— میں نے باوا بنایا ہے۔"

"باوا؟"

"ہاں باوا اور ایسا بنایا ہے کہ بس جان ڈالنے کی کسر رہ گئی ہے تم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی کہ دنیا میں تم سے زیادہ خوب صورت چیزیں بھی بنائی جا سکتی ہیں۔"

"اچھا چلو دکھاؤ"، وہ اشتیاق سے بولی۔

وہ اسے لے کر وہاں آیا جہاں اس نے ساری چیزیں دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھی تھیں مگر وہ یہ جان کر نہایت پریشان ہو گیا کہ گھوڑے، بیل، بندر اور سب چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں مگر آدمی وہاں نہیں تھا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی دُور دُور تک چلچلاتی دھوپ اور چمکتا ہوا کلر پھیلا ہوا تھا کہیں آدمی نہ آدم زاد ——— پرندے تک گھونسلوں اور درختوں کی گھنی شاخوں کی تلاش میں نکل گئے تھے وہ پریشان ہو گیا۔

"پتہ نہیں آدمی کدھر گیا"

"سو بار کہا ہے" زیناں بولی "دوپہر کے وقت آرام کر لیا کرو مگر تم مانتے ہی نہیں۔ مجھے ڈر ہے کسی روز تم سچ مچ سودائی ہو جاؤ گے۔"

"تمھیں یقین نہیں آیا۔" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولا؛ "خدا کی قسم میں نے تمھارے

آنے سے ذرا پہلے اسے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا' آنکھوں سے بنا ہوا دیکھا اور یہاں رکھا تھا اور ابھی تو وہ اچھی طرح سے سوکھا بھی نہیں تھا۔"

"کہیں چلا گیا ہوگا۔" زیناں نے ہنستے ہوئے کہا "کیا پتہ تمھارے لیے تمبا کو لینے گاؤں چلا گیا ہو۔"

اس نے نظریں جھکا لیں اور نڈھال نڈھال سا شریہنہ کے نیچے آگیا' زیناں کچھ دیر خاموش رہی پھر ناخنوں سے درخت کے تنے کی کھال کھرچتے ہوئے بولی :

"تو تم نے سچ مچ باوا بنایا؟"

"اور تو کیا' میں تم سے جھوٹ بول سکتا ہوں؟"

"اگر ایسا ہے تو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" زیناں بولی "تم گھر چلو ——— دیکھو بے وقت ٹھیک نہیں ہوتا' ویسے بھی یہ سنسان جگہ مجھے پکّی معلوم ہوتی ہے۔ ایک دن میں واپس جا رہی تھی تو بڑّے کے پاس مجھے ایسا لگا جیسا کسی نے میرا نام لے کر پکارا ہو ——— میں نے تمھیں نہیں بتایا تھا کہیں تم غلط نہ سمجھو ——— "اللہ کی مخلوق۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی' پھر بولی :

"پتہ ہے ایک بار ابا گدھے پر سوار کہیں جا رہا تھا اس نے دیکھا اس کے آگے آگے ایک اور شخص بھی گدھے پر سوار جا رہا ہے پھر دونوں غائب ہو گئے آدمی بھی اور گدھا بھی۔ ابّا نے اتر کر دیکھا وہاں تک گدھے کے پاؤں کے نشان تھے جہاں سے وہ غائب ہوا تھا۔"

"میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا' وہ بولا" اور پھر انھیں باوے کا کیا کرنا تھا؟"

"اللہ جانے ——— میں تو کہتی ہوں گھر چلے چلو۔"

"نہیں زیناں ——— میں گھر میں چھپ کر کب تک بیٹھ سکتا ہوں اور پھر تمھیں پتہ ہے مجھے گاؤں میں آکر وحشت ہوتی ہے پورے گاؤں میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں ہے جو مجھے آدمی سمجھتا ہو لے دے کے ایک رمجا ہے وہ بھی تمھاری ———"

"ایسی باتیں نہ کیا کرو دتّے۔" وہ اداس لہجے میں بولی "مجھے پتہ ہے کہ تم نفرتوں کے

ستائے اور کئی پشتوں سے محبت کے لیے ترسے ہوئے ہو لیکن میں جو ہوں ——— میری طرف دیکھو ——— میں بھی تو ہوں ——— تم تو پھر دن بھر کھلونوں سے کھیلتے رہتے ہو۔"

" اور تم نے جو اتنے سارے گھگھو گھوڑے پڑچھتی پر سجا کر رکھے ہوئے ہیں ؟ "

" ہاں رکھے تو ہوئے ہیں مگر کیا فائدہ ؟ "

" ویسے زیناں ——— میں سوچتا ہوں تمھیں رب نے اتنا حُسن دیا ہے کہ تم محض شیشہ دیکھ کر بھی وقت گزار سکتی ہو۔"

زیناں کی سمجھ میں نہ آیا کیا کرے، لجائے، اترائے یا چوٹ سہلائے کچھ دیر چپ رہ کر بولی " دتے تم پانی میں گھرے ہوئے پانی ہو تمھیں کیا پتہ آگ کیا ہوتی ہے ؟ " تم آوی میں چیزیں پکاتے ہو لیکن تم نے خود آوی میں پک کر کبھی نہیں دیکھا، اور میں ——— ! "

" میں تو تمھیں پہلے ہی ناری سمجھتا ہوں۔"

" نہ اڑیا ——— مجھے خاکی ہی رہنے دے ——— میں تو ایک بھینس اور ایک گدھی کے عوض۔"

" بھینس اور گدھی کا ذکر بار بار نہ کیا کرو اگر میرے پاس قارون کا خزانہ ہوتا اور تم مجھے اس کے بدلے مل جاتیں تو بھی میں خود کو خوش قسمت سمجھتا۔"

" ذکر کیوں نہ کیا کروں ——— بھینس اب تیسرے چوتھے سوئے میں ہوتی اور گدھی۔"

"تم نہ آتیں تو میرا کیا بنتا ——— برادری والوں نے تو غریب سمجھ کر صاف جواب دے دیا ہوا تھا ——— میرا جنازہ۔"

" ہاں تمھاری روٹی کون پکاتا ——— کپڑے کون دھوتا اور تمھارا جنازہ ؟ " وہ اداس اور پریشان ہو گئی۔

وہ بولا " اب تم گھر چلی جاؤ ——— میں اسے تلاش کرتا ہوں۔"

" دوسرا بنا لو۔" وہ برتن اٹھاتے ہوئے بولی " آخر ایک باوا ہی تو تھا۔"

" دوسرا تو میں کسی بھی وقت بنا لوں گا، اس نے جواب دیا " لیکن وہ پہلا کدھر گیا۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو وہ پہلا والا کدھر گیا۔"

"عجیب بات ہے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کاش میں تمھاری کوئی مدد کر سکتی لیکن میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، اللہ اپنا فضل کرے ——— اچھا میں جاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر چل دی ——— وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، گم صُم کھڑا رہا، جب وہ ٹبّے کے پاس پہنچ گئی تو اس نے اسے آواز دی۔

"زیناں ——— کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

مگر زیناں نے مڑ کر نہیں دیکھا وہ اس کی آواز کی سرحد پار کر چکی تھی۔ اسے پشیمانی ہونے لگی اس نے زیناں کو پہلے کیوں تاکید نہ کر دی کہ وہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرے، لوگ اسے پہلے ہی بے وقوف اور حقیر جانتے تھے۔ نئی بات سن کر اور ہنسی اڑائیں گے اور اس کا جینا دوبھر کر دیں گے۔ پھر اس نے چشمِ تصوّر سے دیکھا زیناں گلی کے موڑ پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

"رمجے ——— تیرے بھائیے نے آج آدمی بنایا۔"

"آدمی بنایا؟"

"ہاں اور وہ غائب ہو گیا۔"

"کون بھائیا؟"

"نہیں آدمی۔"

"بھائیا بھی تو آدمی ہے ——— کہو ہے کہ نہیں۔"

"ہے ——— مگر اس نے باوا بنایا تھا۔"

"دیکھ زینی ——— بجھارتیں نہ ڈالا کر ——— بھائیے کا باوا گم ہو گیا ہے تو تو اُسے دوسرا بنا دے تُو بھی کمھارن ہے۔"

اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں ورنہ زیناں پتہ نہیں کیا کہہ دیتی۔ شام کو وہ گاؤں پہنچا تو اس کا خدشہ درست ثابت ہوا، سارے گاؤں میں باوے کے گم ہو جانے کی

خبر پھیل چکی تھی۔

تنور، چوپال، مسجد اور بڑی دکان پر ہر جگہ لوگ اس کی سادگی اور بے وقوفی پر ہنستے اور وہ جدھر سے گزرتا اُسے چھیڑتے۔

"سُنا ہے دِتّے ——— تیرا بندہ گم ہوگیا ہے؟"

"یار دِتّے ——— بڑا افسوس ہے تونے ساری عمر میں صرف ایک باوا بنایا تھا وہ بھی چیل اُٹھا کر لے گئی۔"

مولوی صاحب نے لاحول پڑھ کر کہا "جب شرک کے کام کرو گے تو ایسا ہی ہوگا۔ کم بخت بُت بناتے ہو، یاد رکھو اللہ ایسے لوگوں کی مَت مار دیتا ہے۔"

اسے بے حد رنج ہوا ——— زیناں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اسے زیناں پر بہت غصّہ آیا مگر وہ ضبط کر گیا۔ اسے پہلے ہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ اس سے روٹھ نہ جائے اس کے پاس زیناں کو اپنے پاس رکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ پتہ نہیں کاغذ کی یہ ناؤ اب تک کیسے سلامت تھی۔ وہ ہر روز گھر آتا اور اسے گھر میں پاکر متعجب ہوتا تھا ——— اسے دوپہر کو اکثر شبہ رہتا تھا لیکن وہ خلافِ توقع ہر روز روٹی لے کر آجاتی تھی۔ باوے والی بات پر اس نے گاؤں والوں کی پھبتیاں، طعنے اور باتیں سنیں اور برداشت کیں اور بظاہر ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے وہ زیناں اور گاؤں والوں سے خود مذاق کر رہا تھا مگر اندر ہی اندر اس کے دل میں گرہ سی پڑ گئی اور اسے عجیب طرح کی چنتا لگ گئی، آخر وہ کدھر گیا؟ کون لے گیا؟

زیناں کو اس کی بات کا یقین آگیا اور وہ جلد ہی بھول گئی۔ لوگ بھی بھول گئے مگر وہ پریشان اور اداس رہنے لگا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب اس کے اور زیناں کے سوا وہاں کوئی نہیں آیا تھا تو وہ کدھر گیا۔ زیناں اس سے پریشانی اور اداسی کا سبب پوچھتی تو وہ اُسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹال دیتا۔

وہ گھگھو گھوڑے بناتا اور آوی میں پکاتا رہا اور زیناں سر پر کھاری رکھے آس پاس کے دیہاتوں میں گلی گلی گھومتی اور کھلونے بیچتی رہی ——— شریہنہ کی ٹہنیاں کٹ کٹ کر

گاؤں کے گھروں کے مختلف دروازوں پر سجتی رہیں۔ بہت سا وقت گزر گیا مگر اس کی اُلجھن دور نہ ہوئی۔

اس دوران اس نے شہر جا کر جوتشی سے بھی پوچھا ——— سائیں بہادر شاہ کے میلے پر طوطے سے فال بھی نکلوائی اور پیر ہدایت اللہ سے تعویذ بھی لیا مگر اس کی اُلجھن دور ہوئی نہ اس کے ذہن سے باوے کا خیال محو ہوا کئی بار اس نے سوچا کہ وہ پھر سے بنالے ——— سامنے بیٹھ کر سکھائے اور پکائے لیکن یہ سوچ کر اسے ہول آتا تھا کہ اگر اس کے دیکھتے دیکھتے وہ غائب ہو گیا تو؟

اس نے ہر پُوریں سے اچھے اچھے کھلونے نکال کر گھر کی پڑچھتی پر محفوظ کیے ہوئے تھے اگر باوا پڑچھتی پر پڑا پڑا غائب ہو گیا تو وہ سچ مچ پاگل ہو جائے گا اور زیناں کو پتہ چلا تو وہ خوف اور دہشت کے مارے بے ہوش ہو جائے گی اور گھر کے درودیوار سے خوف کھانے لگے گی۔

موسم آتے جاتے رہے، رُتیں بدلتی رہیں۔ بہار کے موسم میں نئی کونپلیں پھوٹتی اور برسات کے دنوں میں بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آتے رہے۔ پھر ایک موسم برسات میں آسمان سے اس قدر پانی برسا کہ جل تھل ایک ہو گیا۔ سیلاب کا پانی اترا تو کلر زدہ زمین پر جا بجا گھاس اور طرح طرح کی بُوٹیاں اُگ آئیں۔

ایک ایسی صبح کو جب منڈیروں پر کوّے کلول کر رہے تھے اور چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ دِتّے کے گھر سے چلم کے لیے جلائے گئے اُپلوں کا دھواں اور زیناں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں جو تھوڑی دیر بعد گھنگھریالے قہقہوں میں تبدیل ہو گئیں ——— اور اُسے پتہ چلا کہ اس کے گھر کے آنگن میں ایک ننھا سا شریہنہ اگ آیا ہے پتہ نہیں شریہنہ کے بیج کب اور کیسے گھر میں آئے تھے۔ کیا خبر بچوں کی کوئی پھلی زیناں کی کھاری یا چنگیر میں آگئی ہو۔ کوئی بیج اس کے اپنے جوتوں کے ساتھ چپک کر وہاں پہنچ گیا ہو یا پھر ہوا کے جھونکے اُسے اُڑا لائے ہوں۔

"شریہنہ برکت والا درخت ہے۔" اس نے سوچا اور اس کی نسل گاؤں میں ختم نہیں ہوئی

بوڑھا شر بہنہ ابھی کھڑا تھا کہ دوسرا اُگ آیا۔"

گھر کی پڑچھتی پر رکھے ہوئے کھلونوں کی گرد صاف کی گئی اور گھر کے اندر سارے فرش پر گوبر کا لیپ کیا گیا۔

زیناں ٹھیک ہوگئی اور کام کاج کرنے لگی تو وہ بھی ایک صبح کام پر روانہ ہوا۔ زیناں نے کہا" دوپہر کو گھر آجانا دِتّے ——— وہاں رہنا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ٹھیک نہیں"

"تمھیں یاد ہے وہ باوا۔"

"باوا۔" وہ چونک پڑا۔

"ہاں وہی باوا ——— جس کے غم میں تم اتنا عرصہ اداس اور پریشان رہے۔"

"تو تم جانتی ہو؟"

"ہاں۔"

"اور تمھیں یقین ہے میں نے بنایا تھا؟"

"ہاں مجھے یقین ہے کہ پورے گاؤں میں ایک ہی آدمی ہے جو اُن چیزوں سے بھی محبت کرسکتا ہے جو اس نے نہ بنائی ہوں۔"

اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے زیناں کی طرف دیکھا اور اوزار اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اپنا گھر

ہیں گندی اور بدبودار نالیوں ہیں چاروں طرف سے کھڑا ہوا تالاب
بارش اور تازہ پانی کی بوندوں کو ترستا ہوا۔
ایک جیسی صبحیں ایک جیسی شامیں۔
وہی گھر، وہی آنگن، وہی شہر اور سڑکیں۔
وہی ہر طرف مداریوں کی طرح چتر چالاک آدمی اور آسمان ہیں تھگلی لگانے والی
بارہ تالن عورتیں۔
منافقت سے اٹی ہوئی صورتیں ——
خود غرضی کے جالے —— سازشوں کی مکڑیاں اور وہی ٹانگیں کھینچنے اور
میرے اٹھنے بیٹھنے کی جگہوں پر مرغیوں کی طرح گندگی پھیلاتے احباب! وہی ہر روز ایک
ہی طرح سو کر اٹھنا اور وہی ستر ستر قدم پیچھے ہٹ کر ایک دوسرے سے ٹکریں مارتی
گھر کی دیواریں۔
بھاگم بھاگ دفتر کے لیے تیار ہونا۔
وہی میز اور وہی ایک جیسا ناشتہ
وہی دفتر اور وہی مردار کے انتظار ہیں بیٹھے ہوئے گدھوں کی طرح افسرانِ بالا
کی نظریں۔

وہی فائلیں اور وہی ایک جیسے تے کیے ہوئے لفظوں سے ان کا پیٹ بھرنا۔
باہر سے تھک کر گھر آنا اور گھر سے اکتا کر باہر نکل جانا۔
کوئی سا کام بھی کرتا —— لگتا صدیوں سے یہی کر رہا ہوں۔ دفتر میں ٹیلی فون سنتے وقت ہیلو کہتا تو معلوم ہوتا جب سے پیدا ہوا ہوں ہیلو ہیلو کر رہا ہوں۔ ڈپو سے آٹا لینے کے لیے قطار میں کھڑا ہوتا تو لگتا جب سے کھڑا ہونا سیکھا ہے آٹا لینے کے لیے قطار میں لگا ہوں اور کبھی باری نہیں آئے گی۔

منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کسی دوست کے گھر جاتا تو وہاں بھی وہی سب کچھ پرانا اور برتا ہوا معلوم ہوتا —— وہی میز اور کرسیاں اور وہی ان کی ہمیشہ سے دیکھی ہوئی ترتیب۔ باتوں کے ایک جیسے موضوعات۔ وہی ہر گھر کی اپنی ایک مخصوص خوشبو یا بدبُو —— ایک جیسی چائے اور چائے کے برتن وہی ایک طرح سے میزبان کا ہر بار مصنوعی خندہ پیشانی سے استقبال کرنا اور خیریت پوچھنا اور وہی ایک جیسے کھوکھلے اور بناوٹی قہقہے!

اکتاہٹ اور بیزاری کی بارش سے بچنے کے لیے میں نئی نئی مصروفیات اور مشاغل کی چھتریاں تلاش کرتا —— گہری خاموشی اور سناٹے میں پتہ بھی گرے تو آواز چونکا دیتی ہے۔ گھُپ اندھیرے میں جگنو بھی دِیا معلوم ہوتا ہے۔ میں گھر میں کپڑے لٹکانے والی نئی کھونٹی لاکر ٹھونکتا یا بیوی نئے رومال میں لپیٹ کر روٹی لاتی تو کچھ دیر کے لیے گھر نیا نیا لگنے لگتا۔ ہم دونوں میاں بیوی کماتے اور چھوٹی بڑی چیزیں خرید خرید کر گھر کو باسی ہونے سے بچانے کی کوشش کرتے رہتے مگر ہر نئی چیز اگلی صبح کو پرانی ہو جاتی۔ پھر ہم میزوں، کرسیوں، صوفوں اور پلنگوں کی ترتیب بدل کر کام چلاتے۔ آپس میں لڑ پڑتے۔ جن سے لڑائی ہوتی ان سے صلح کر لیتے اور جن سے گاڑھی چھن رہی ہوتی ان سے دشمنی مول لے لیتے۔ لیکن بات نہ بنتی، مزہ نہ آتا —— لگتا —— جیسے ہم ایک بڑے سارے کنوئیں میں قید ہیں اور باہر نکلنے کے لیے دن رات ہاتھ پاؤں مارتے اور لہولہان ہوتے رہتے ہیں۔

ایک روز میں نے ایک کتاب پڑھی اور جلدی سے بند کرتے ہوئے کہا:

"پتہ چل گیا ہے۔"

اس نے پوچھا "کس بات کا"

"باسی ہو جانے کا"

"وہ کیسے؟"

"وہ اس طرح کہ ہم نے اپنے لیے بہت سی دشواریاں اور مشکلات خود پیدا کی ہیں۔ ہمیں خود نمائشی، تکلفات اور تصنع کی زندگی ترک کر کے سادہ اور فطری زندگی گزارنی چاہیئے۔ آسائشوں اور سہولتوں نے ہم سے سچّی زندگی کا ذائقہ چھین لیا ہے اور سادگی کی ابتدار آج ہی سے ہونی چاہیئے۔" اس نے کہا۔ "کیوں نہ ہم چھٹیاں لے کر کچھ دنوں کے لیے گاؤں چلے جائیں اور بے تکلفی، سادگی اور فطری زندگی گزارنے کی عادت ڈالیں اور کھوئے ہوئے سچّے ذائقوں سے آشنائی حاصل کریں۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہے ——— مجھے بھی گاؤں گئے ہوئے کئی برس ہو گئے ہیں۔ گاؤں والے جب بھی آتے ہیں شکایت کرتے ہیں کہ میں گاؤں کو بھول گیا ہوں ——— ممکن ہے آب و ہوا کی تبدیلی سے باسی اور بدبودار ہونے کا یہ احساس کم ہو جائے جو ہمیں ایک جیسے باہر سے چمکتے مگر اندر سے سیاہ لوگوں میں رہتے ہوئے دن رات گھیرے رکھتا ہے۔"

اس نے کہا "پروگرام بنایئے ——— میں بھی ایک جیسے برتنوں میں آلو گوشت اور گوشت آلو پکا پکا کر اکتا گئی ہوں۔ کہیئے کب چلنا ہے؟"

"تم تیاری شروع کر دو۔" میں نے جواب دیا۔

اور گاؤں جانے کی تیاری شروع ہوئی۔

اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا۔ ہم نے اپنے اپنے دفتروں میں چھٹی کی درخواستیں دیں اور منظور کرائیں۔ ریل کار کی سیٹیں بُک کرائیں اور ایک دوست سے کہہ کر ایک قابلِ اعتماد قسم کا آدمی تلاش کیا جو ہماری غیر حاضری میں گھر کی چوکیداری کر سکے۔ اسے دو تین روز پہلے

بلا کر سب کچھ سمجھا دیا گیا کہ پانی کا نل اور رسوئی گیس کا چولہا کس طرح بند کرتے ہیں اسے تاکید کر دی کہ وہ رات کو زیادہ دیر تک بتی نہ جلائے رکھے۔ دودھ والے سے ایک پاؤ سے زیادہ نہ لے۔ اخبار والے کو منع کر دیا ہے مگر وہ غلطی سے اخبار ڈال جائے تو اس کی دکان پر واپس کر آئے۔ مرغیوں کو دانہ ڈالتا رہے اور قصاب کی دکان سے چھچھڑے لا کر بلّی اور کتّے کو ڈالنا نہ بھولے، اسے ڈاک کے بارے میں بھی بتا دیا گیا کہ کہاں اور کیسے سنبھال کر رکھنی اور بیرنگ خطوط کس طرح واپس کرنے ہیں اور اگر کوئی مہمان آجائے تو اس کے مرتبے کا اندازہ کس طرح لگانا اور اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ ٹیلی فون کس طرح سننا اور کیا جواب دینا ہے اور رانگ نمبر سے کس طرح نمٹنا ہے۔

چوکیدار شریف اور اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا پھر بھی ہم نے پڑوسیوں کو فرداً فرداً تاکید کر دی کہ وہ ہمارے گھر اور چوکیدار کا خیال رکھیں اور اس کی نگرانی کرتے رہیں کہ وہ اپنی ڈیوٹی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے یا نہیں اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو ہمیں گاؤں کے پتہ پر تار دیں۔

اس کے بعد سامان بندھنے لگا۔ بچّوں کے لیے خاص طور پر ایسے کپڑے سلوائے گئے تھے جو گاؤں کی گلیوں کی کیچڑ اور گرد و غبار میں بھی کام دے سکیں۔ اپنے لیے ہم نے ریشمی اور قیمتی کپڑوں کے علاوہ سیدھے سادے اور رات کو پہننے والے کپڑے بھی ساتھ رکھ لیے۔ تولیے، بنیانیں، انڈر ویئر، جرابیں، مفلر، کمبل، ٹائیاں، ازار بند، سوٹ، کوٹ اور پتلونیں۔ اس کے علاوہ سوئیٹریں، کوٹیاں، پاجامے، شلواریں، کرتے اور ہر قسم کے جُوتے اور چپلیں، پتہ نہیں کس چیز کی کب ضرورت پڑ جائے اور پھر آخر گاؤں میں ہمیں والدین کے گھر میں تو بند نہیں رہنا تھا اور پھر گاؤں والے کیا سوچتے کہ ان کے پاس بس یہی دو چار جوڑے کپڑوں کے ہیں جنھیں بدل بدل کر پہنتے رہتے ہیں۔

اس خیال سے کہ گاؤں میں اچھی قسم کی چائے کی پتّی نہیں ملے گی۔ ہم نے چائے کے دو ایک ڈبّے بھی ساتھ رکھ لیے اور اس خیال سے کہ خالص دودھ کی چائے شاید بچّوں کو ہضم نہ ہو یا ہمیں اس دودھ سے مہک آئے خشک ولایتی دودھ کا ایک ڈبّہ بھی رکھ لیا۔

پپو کے لیے دو چار نپل فالتو رکھ لیے اور ضد کرنے کی صورت میں اسے منانے کے لیے ٹافیاں بسکٹ اور چیونگم بھی ۔ بلکہ چند ایک غبارے بھی رکھ لیے ۔ وہ جب بھی ضد کرتا تھا غبارہ لے کر بلکہ پھاڑ کر چُپ ہوتا تھا تاہم ہم نے غباروں میں ہوا نہیں بھرائی کیوں کہ ہم تبدیلی آب و ہوا کے لیے ہی تو جا رہے تھے اور گاؤں میں ہوا شہر کی نسبت زیادہ صاف اور خاصی مقدار میں دستیاب تھی ۔

گاؤں کی چھوٹی سی دکان پر چیزیں اچھی نہیں ملتیں اور پھر مہنگی بھی ہوتی ہیں اس لیے کپڑے دھونے کا پاؤڈر، نہانے کا صابن، شیمپو، ہیئر ٹانک اور ہیئر کریم، ٹوتھ پیسٹ اور منجن، شیونگ اور میک اپ کا سامان بھی ہم نے ساتھ رکھ لیا ۔ ریڈیو، ٹرانسسٹر اور ٹیپ ریکارڈ تو بہر حال ضروری چیزیں تھیں ۔ گاؤں میں گزارے ہوئے لمحوں کو محفوظ کرنے کے لیے کیمرے میں نئی فلم بھی ڈلوالی ۔ بڑے لڑکے کو عرصہ سے بندوق کا دھماکہ سُننے کی خواہش تھی اس لیے کچھ کارتوس اور بندوق بھی ساتھ رکھ لی کیا پتہ کچھ شکار وغیرہ بھی مل جائے ۔ گاؤں میں جوتے جلد خراب اور میلے ہو جاتے ہیں اس لیے مختلف رنگوں کی پالش اور برش بھی ضروری تھے لکھنے پڑھنے کا سامان، رائٹنگ پیڈ، دو چار خوب صورت بال پوائنٹ، سادہ اور ڈاک کے لفافے اور ٹکٹیں ۔ گاؤں میں بیٹھ کر دوستوں اور جاننے والوں کو خط لکھیں گے اور گاؤں کی سادہ اور فطری زندگی کی تصویر کشی کریں گے ۔

پڑھے لکھے آدمی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ لکھتا یا پڑھتا ہوا دکھائی دے ۔ اب گاؤں میں اخبار ملنے کا تو کوئی امکان ہی نہیں تھا چناں چہ ہم نے چند ایک رسالے، شاعری اور افسانوں کے مجموعے، انگریزی کے چند ایک ناول جنھیں خرید کر محض سجاوٹ اور بھرم قائم رکھنے کے لیے بک شیلف میں رکھا ہوا تھا ساتھ لے لیے کہ فراغت ہوگی اور مطالعہ کریں گے ۔ ساتھ ہی لوگوں کو حیران کریں گے کہ یہ اتنی موٹی موٹی کتابوں کے اتنے باریک باریک الفاظ کیسے پڑھ لیتے ہیں ۔ بیوی کو کبھی کبھی پِتّے کا درد ہو جاتا تھا اِس لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر فوری اثر کرنے والی گولیوں کی شیشی، ننھّے کا گلا خراب ہو جانے کے امکان کے پیشِ نظر اس کا سیرپ اور ہنگامی ضرورت کی دوسری دوائیں اور تھرمامیٹر ـــــ

گاؤں میں اچھی برانڈ کے سگریٹ کہاں، چناں چہ دو چار کارٹن سگریٹوں کے ——— خوشنما گیس لائیٹر کی گیس کی شیشی۔

بچّے ناشتہ میں ڈبل روٹی کے عادی تھے چناں چہ رس اور ڈبل روٹیوں کا انتظام بھی کر لیا گیا۔ کسٹرڈ پاؤڈر، سویّاں اور خشک میوے ہم ویسے ہی گاؤں والوں کے لیے تحفے کے طور پر لے جا رہے تھے اور گھر میں ڈپو سے منگا کر جو چینی رکھی ہوئی تھی وہ بھی ساتھ رکھ لی بلکہ بیوی نے بہت سی آوٹ آف فیشن ہو جانے والی کراکری بھی ایک بڑے سارے ڈبے میں بند کر لی اس کا ارادہ تھا وہ واپسی پر یہ کراکری وہیں چھوڑ آئے گی اور ڈبے میں چاول بھر لائے گی۔

جس روز ہمیں جانا تھا اس رات کو بارش ہو گئی۔

ریل سے اتر کر گاؤں جانے کے لیے بس کا سفر کرنا پڑتا تھا اور ایسے موسم میں پھسلن کی وجہ سے بس کے حادثے کا ڈر تھا۔ ہم نے ریل کار کے ٹکٹ واپس کیے اور ریلوے کے ایک بڑے افسر سے سفارش کرا کے دو روز بعد کی سیٹیں بک کرائیں ——— مگر اسی شام کو اچانک والد صاحب آ گئے۔

انھیں معمولی اور میلے کچیلے کپڑوں میں دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ہل چلاتے یا چارہ کاٹتے ہوئے اچانک کوئی بری خبر سن کر اٹھ کھڑے ہوں اور کپڑے تبدیل کیے بغیر آ گئے ہوں۔ ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا ہم پریشان ہو گئے خدا خیر کرے سلام دعا کے بعد پوچھا تو کہنے لگے

" آج صبح نلائی کرتے ہوئے اچانک تم لوگوں اور بچّوں کو دیکھنے کے لیے دل تڑپا ——— میں نے گھر جا کر تمھاری والدہ کو اطلاع دی۔ کرایہ لیا اور چلا آیا ——— سوچا اپنے ہی گھر تو جا رہا ہوں۔"

ماس اور مٹی

سب سے پہلے حمد اس رب کی جس کی قدرتوں کا کوئی شمار نہیں۔
اس نے لاکھوں کروڑوں دنیائیں، کہکشائیں اور چاند سورج پیدا کیے۔
اس نے دس لاکھ میل قطر کا سورج بنایا اور اسے کائنات میں ایک نقطے کی حیثیت بخشی۔ اس نے اربوں، کھربوں ایسے ستارے بنائے جن میں سے بعض کی روشنی ہم تک لاکھوں کروڑوں سالوں میں پہنچتی ہے۔
پھر درود اس نبیؐ پر جس نے بادشاہوں کو فقیری اور فقیروں کو بادشاہت دے کر ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا اور اس نے ان کی عقلوں سے پتھر ہٹا کر اپنے پیٹ پر باندھ لیے۔
پھر سلام روشنی کے ان میناروں کو جنھوں نے باطل کا ساتھ نہ دیا اور حق کی خاطر اپنی گردنیں کٹوائیں اور کھالیں اتروائیں۔
پھر رحمت ان عظیم لوگوں پر جنھوں نے فضا میں ایتھر، زمین میں تیل اور ایٹم میں الیکٹرون پروٹون دریافت کیے۔
اور آخر میں شاباش ان بہادروں کو جنھوں نے ہر حال میں زندگی کا سفر جاری رکھا اور اس رب کا جس کا ذکر اوپر آیا ہے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔
حمد، نعت اور اس تمہید کے بعد اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

یہ کہانی میرے اپنے گرد گھومتی ہے لیکن اس کا مرکزی کردار ناتوسانسی ہے ——
ناتوسانسی میرے گاؤں کا رہنے والا ہے اور کچھ عرصہ سے گاؤں چھوڑ کر شہر میں آ گیا ہے۔ آپ نے اخبارات میں اکثر پڑھا ہو گا کہ کچھ عرصہ سے شہر میں چوری کی انوکھی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ چوروں کی ایک ٹولی بڑے بڑے بنگلوں میں گھس کر یا نقب لگا کر باورچی خانوں سے کھانے پینے کی ہر چیز چٹ کر جاتی ہے۔ ان بھوکے پیاسے چوروں کے ہاتھ جو چیز لگتی ہے وہ کھا پی کر غائب ہو جاتے ہیں۔ کپڑے، زیور، نقدی اور دوسری قیمتی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ وہ شربت، بیئر اور اسکوائش کی بوتلیں پی جاتے ہیں۔ ریفریجریٹروں میں رکھی آئس کریم، پھل، مکھن اور ڈبل روٹیاں کھا جاتے ہیں اور جتنی بھی شکر ملے پھانک جاتے ہیں۔

رب نے ہر انسان کی روزی مقرر کی ہوئی ہے۔

وہ پتھر میں کیڑے کو بھی پالتا ہے۔

اس نے ہر آدمی کا حصّہ زمین کے اندر کہیں نہ کہیں چھپا کر رکھ دیا ہوا ہے تاکہ وہ دُنیا میں آئے تو اپنا حصہ تلاش کر لے۔

کچھ لوگ اپنا حصّہ تلاش نہیں کرتے اور بھوک سے مر جاتے ہیں یا مانگ تانگ کر اور چھین جھپٹ کر وقت گزارتے ہیں۔

بعض دوسروں کے حصّے بھی تلاش کر لیتے ہیں پھر مانگنے والوں کو تھوڑا تھوڑا دے کر دعائیں لیتے اور ثواب کماتے ہیں۔

چوروں کی یہ ٹولی بھی اپنا حصّہ تلاش کرتی پھرتی ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس ٹولی میں کم از کم چھ سات چٹوڑے آدمی ضرور ہیں جو دس بارہ آدمیوں کی خوراک ایک ہی وقت میں ہضم کر جاتے ہیں۔ ٹڈی دل کی طرح جہاں سے گزر جاتے ہیں ہر چیز کا صفایا کر دیتے ہیں۔

مجھے شبہ ہے ناتوسانسی ان میں ضرور شامل ہے۔

میں نے اسے کئی مرتبہ بس اسٹاپوں، پھل فروٹ کی دکانوں اور سینماؤں کے

ٹی اسٹالوں پر دیکھا ہے اس نے بھی مجھے دیکھا ہے لیکن شاید میرے لباس کی وجہ سے وہ مجھے پہچان نہیں سکا یا جان بوجھ کر اجنبی بنا رہا ہے کہ سلام نہ کرنا پڑے۔ مجھے یاد ہے اس نے زندگی بھر گاؤں کے کسی زمیندار یا چودھری کو سلام نہیں کیا شاید یہی وجہ تھی کہ ہر ایک کو اس پر خواہ مخواہ غصّہ آجاتا تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کو اس پر محض اسی وجہ سے غصّہ آتا تھا۔ شہر آنے سے پہلے اس نے گاؤں والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ابّا جی کو ڈر تھا کہ وہ شہر آکر مجھے ڈھونڈھ لے گا اور پھر روزگار یا بھیک کے سلسلے میں ہر وقت مجھے پریشان کرتا رہے گا لیکن اس نے تو مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا ہے اور اسے اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اسے گلے سڑے پھل جمع کرتے اور سگریٹ کے ٹکڑے چنتے دیکھا ہے۔ سینماؤں میں انٹرول کے وقت وہ ٹی اسٹالوں پر کھڑا نظر آتا ہے اور کوکا کولا اور سیون اپ کی بوتلوں پر بچے کھچے گھونٹ پیتا ہے جنھیں لوگ اس لیے چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے پیٹ میں جگہ نہیں ہوتی کئی بار میرا جی چاہا اسے اپنے پاس بلاؤں اور کچھ دے ڈالوں مگر اس کی بے نیازی دیکھ کر ارادہ ترک کرنا پڑا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے فلٹر ٹپڈ سگریٹوں کا دھواں اڑاتا اور باری باری ہر بوتل سے بچا کھچا سوڈا واٹر پیتا رہتا ہے۔ اس نے کبھی میری پروا نہیں کی۔ اسے شاید کسی کی بھی پروا نہیں۔ اپنے باپ کی بھی نہیں جسے اس کے بدلے گاؤں والوں نے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور اس کی چمڑی ادھیڑ دی تھی۔ اس کا باپ عرصہ سے اپنی ادھڑی ہوئی کھال، کٹے ہوئے جسم اور ٹوٹی ہڈیوں سمیت چارپائی پر پڑا کراہتا رہتا ہے مگر ناتو نے پلٹ کر کبھی اس کی خبر نہیں لی۔

ہم دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں لیکن ہم ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہوئے۔ ہمارے درمیان دن بدن فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے لیکن مجھے بھی اس کی پروا نہیں آخر ناتو میرے کس کام آتا ہے۔

میں نے گاؤں میں بھی شاید ہی کبھی اس سے بات کی ہو۔ میرا اس سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ ہاں اس کی ماں [illegible] ولد اور بہن مادو ہر روز بھیک مانگنے گاؤں کا چکر

لگاتی ہوئی ہمارے ہاں بھی آتیں اور دعائیں دیتیں۔ مجھے دیکھ کر اکثر وہ تھوڑی بھیک پر قناعت نہ کرتیں اور اماں کو معمول سے کچھ زیادہ دینا پڑتا۔

شیرو اس کا باپ تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ کام نہ کرنا ان کی خاندانی روایت تھی۔ وہ چوری کر سکتے تھے، ڈاکہ ڈال سکتے تھے، قتل کر سکتے تھے، شکار کھیل سکتے تھے مگر کام کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ عالمے اور مادو کی جمع کی ہوئی بھیک مزے لے لے کر اڑا سکتے تھے مگر خود بھیک نہیں مانگتے تھے۔ مانگ ہی نہیں سکتے تھے۔

وہ حرام حلال کے چکّر میں نہیں پڑتے تھے۔ کچھوے، بلّیاں، گیدڑ، نیولے اور لومڑیاں سب کچھ کھا جاتے تھے۔ مرے ہوئے مویشیوں کا ماس، کتّوں، کوّوں اور گدھوں سے چھین کر ہڑپ کر جاتے تھے، ماس کھانا انھیں بے حد اچھا لگتا تھا خواہ وہ مرے ہوئے مویشیوں کا ہو یا مارے ہوئے مویشیوں کا —— ہم آپ مردار جانور یا مویشی کا ماس نہیں کھاتے۔ کھانے کے لیے اسے خود مار لیتے ہیں۔ ہم زندہ مویشیوں کی بوٹیاں نہیں اتارتے، زندہ انسانوں کی بوٹیاں اتار لیتے ہیں لیکن وہ الگ مسئلہ ہے۔

شیرو بڑا بھلا مانس اور قناعت پسند تھا۔ اس نے آج تک ریل گاڑی نہیں دیکھی تھی۔ وہ کبھی شہر نہیں گیا تھا۔ وہ شکار اور مردار پر گزارہ کر لیتا تھا یا پھر عالمے اور مادو کی لائی ہوئی بھیک سے پیٹ بھر لیتا تھا۔ اکثر دارو پی کر اور حقّے پر کیکر کی چھال کے انگارے رکھ کر وہ دیوار سے لگا بیٹھا رہتا اور گدھوں کی پرواز کا جائزہ لیتا رہتا۔ مگر ناتو نے گاؤں والوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ گھروں، کھیتوں اور کھلیانوں میں ہر جگہ ہاتھ صاف کرنے لگا تھا۔ وہ ڈربوں سے مرغیاں ہی نہیں، باڑوں سے بھیڑ بکریاں بھی اٹھا کر لے جاتا تھا اور ان کو مار کر کھا جاتا تھا۔ وہ کھیت میں گھس جاتا تو کسی جنگلی بھینسے یا سور کی طرح مرلہ مرلہ جگہ صاف کر دیتا۔ مولیاں، گاجریں، شلجم، خربوزے جو کچھ بھی ہوتا وہ فصل اجاڑ کر رکھ دیتا۔ گنّے کا پھوک دیکھ کر لگتا جیسے بہت سا کماد بیلنے میں پیلا گیا ہو۔ یہی نہیں وہ چراگاہوں میں چرتی بھینسوں، گایوں اور بکریوں کا دودھ پی جاتا۔ کئی بار

اُس کی پکڑ دھکڑ ہوئی اور اسے مارا پیٹا گیا مگر وہ کبھی باز نہ آیا۔

لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے اور اکیلا دکیلا آدمی اس سے اُلجھنے سے گریز کرتا تھا۔ اس سے دشمنی سہیڑنا بھی مہنگا پڑتا تھا اس کا کیا بھروسہ کب کیا اٹھا کر لے جائے۔

عالمے اپنی جوان بیٹی کے ہمراہ جب صبح کو گھر گھر مانگنے جاتی تو اسے بھیک کی بجائے گالیاں اور شکایتیں ملتیں۔ وہ بیبیوں کو دعائیں دیتی، ان کی ہاں میں ہاں ملاتی اور اوپرے دل سے ناتو کو بددعائیں دینے جاتی۔

ایک بار گاؤں گیا تو پتہ چلا، ناتو شہر چلا گیا ہے۔ وہ شیرو کو اکثر دھمکیاں دیا کرتا تھا کہ میرا بیاہ کر دو ورنہ میں کسی عورت کو خود اٹھا لاؤں گا یا پھر شہر چلا جاؤں گا۔ جہاں کوکے کولے پیوں گا، پھل فروٹ کھاؤں گا اور جہاں مجھے کوئی نہ کوئی عورت بھی مِل جائے گی۔

ناتو کے چلے جانے سے گاؤں والے خوش تھے مگر وہ جاتے جاتے جِن بھوتوں کی طرح ہاتھ دکھا کر گیا تھا۔ پتہ نہیں یہ واقعہ پیش نہ آتا تو ابھی وہ شہر نہ جاتا۔

پنچایت کے سامنے شیرو اور عالمے کے بیانات سے پتہ چلا تھا کہ اس روز بڑی سردی تھی۔ ٹھنڈی برفانی ہوا چل رہی تھی اور بوندا بوندی ہو رہی تھی۔

اس روز شیرو نے دارو کے نئے مٹکے کا ڈھکنا پہلی مرتبہ کھولا تھا اور دارو کی بُو تالاب کے دوسرے کنارے تک پھیل گئی تھی۔ شیرو نمبردار کی مری ہوئی بھینس کا پانچ سات سیر گوشت کاٹ لایا تھا اور اسے انگاروں پر بھون رہا تھا۔

ناتو سارے گاؤں میں باؤلے کتّے کی طرح ماس ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ بھیڑ بکریوں اور دوسرے جانوروں کا تازہ گوشت کھا کھا کر اب ناتو کو مردار اچھا نہیں لگتا تھا۔ گاؤں کی گلیوں میں بچھڑے کے تازہ اور کچّے گوشت کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ رحمو موچی کے گھر سے لوگ سیر دو سیر گوشت خرید کر نکلتے تو ناتو کا جی چاہتا وہ جھپٹ لے اور بھاگ جائے۔ اس نے رحمو موچی کے گھر میں جھانک کر دیکھا تھا وہاں بہت سے آدمی اور گوشت کاٹنے کے اوزار تھے۔ وہ پلٹ آیا۔

وہ دن عاملے کے سانپ ڈسوانے کے دن تھے مگر پتہ نہیں دنیا بھر کے سانپ کس بِل میں جا چھپے تھے۔ اس کا جسم پھوڑے کی طرح پک رہا تھا اور اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کے جسم سے زہر کے پرنالے ابھی ابھی بہنے لگیں گے۔

اگر اس کے ڈسوانے کے دن نہ ہوتے تو عاملے ناتو پر مادو کا راز کبھی نہ کھلنے دیتی۔ مگر اب ناتو مادو کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا ——— پتہ نہیں وہ اسے کہاں بیچ دے اور اس کے بدلے میں اپنا بیاہ رچالے ——— عاملے نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر ایک ہی دھکّا کھا کر اٹھنے کے قابل نہ رہی تھی۔

ناتو کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر شیرو سے نہ رہا گیا وہ تلخی سے ہنس کر بولا:

"اسے نہ لے جا ——— ناتو ——— یہ عورت نہیں ہے۔"

"عورت نہیں ہے؟" ناتو کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔

"ہاں پُتّر ——— یہ ربّ کی قدرت ہے ——— یہ عورت ہے نہ مرد یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

پھر اس نے آگ پر گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے بھونتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولا:

"جب ربّ اسے بنانے لگا، مٹی کم پڑ گئی ——— ربّ کو اور بہت سے کام ہوتے ہیں اسے اور بہت کچھ بنانا ہوتا ہے۔"

ناتو نے غصّے سے ربّ کی طرف دیکھا مگر ربّ نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے شیرو کی طرف دیکھا۔ وہ ادھ بھنا گوشت ہڑپ کیے جا رہا تھا۔

اس نے غصّے سے کہا "میں سب کو دیکھ لوں گا۔"

اس نے ٹوٹے ہوئے دروازے کو زور سے ٹھوکر مار کر گرا دیا اور باہر نکل گیا۔

اگلے روز چودھریوں نے ڈنگر ڈاکٹر کو بلوایا اور کہیں شام کو جا کر پتہ چلا کہ زندہ گائے کی داہنی ران کو چیر کر سیر دو سیر گوشت نکالا گیا ہے اور کھال میں بھس بھر کر اسے تندی سے سی دیا گیا ہے۔ لوگ ناتو کی تلاش میں نکلے وہ کوکا کولا پینے اور پھل فروٹ کھانے

کے لیے شہر چلا گیا تھا۔

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ شہر میں کچھ عرصے سے چوری کی انوکھی وارداتیں ہو رہی ہیں چوروں کی ایک ٹولی بنگلوں میں گھس کر کھانے پینے کی ہر چیز چٹ کر جاتی ہے۔

پولیس کا خیال ہے کہ اس ٹولی میں کم از کم چھ سات آدمی ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ایک ہی آدمی ہے جو کئی صدیوں سے بھوکا ہے۔

اوور ٹائم

اسے دفتر بند ہو جانے کے ایک گھنٹہ بعد تک اوور ٹائم بیٹھنے کی اجازت مل جاتی تھی اور ایک روپیہ فی گھنٹہ کے حساب سے بیس پچیس روپے ماہوار تنخواہ سے زیادہ مل جاتے تھے اس نے کئی بار کوشش کی تھی کہ اسے ایک گھنٹہ مزید اوور ٹائم کام کرنے کی اجازت مل جائے لیکن اس کے انچارج نے کبھی اس کی منظوری نہیں دی۔

آج بھی وہ دفتر بند ہو جانے کے ایک گھنٹہ بعد گھر جانے کے لیے باہر نکل رہا تھا کہ چوکیدار نے اسے جی ایم صاحب کی والدہ کے انتقال کی خبر سنائی۔

دکھ کی ایسی خبروں میں جن کا تعلق کسی دوسرے سے ہو آدمی کے لیے اطمینان کا ایک پہلو بھی موجود ہوتا ہے کہ یہ حادثہ یا المیہ اس کے اپنے ساتھ پیش نہیں آیا۔ اس نے بھی یہ خبر ایسے ہی اطمینان بخش ملال کے ساتھ سنی، ویسے بھی اس کا جی ایم کے ساتھ براہِ راست کوئی تعلق یا واسطہ نہیں تھا البتہ پچھلے ہفتے اس نے اپنی ترقی کے لیے ان کے نام ایک اپیل تھرو پراپر چینل بھجوائی تھی جس میں ذاتی طور پر حاضر ہونے اور اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت بھی مانگی تھی اور وہ اسی روز سے پریشان اور خائف تھا کہ وہ ان کا سامنا کیسے کرے گا اور اپنا موقف کس طرح بیان کرے گا۔ اس کے اور جی ایم صاحب کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ درمیان میں کتنے ہی بڑے بڑے افسران دشوار گزار پہاڑوں کی طرح ایستادہ تھے جن کے سامنے جا کر اس کی ٹانگیں کانپنے اور زبان لڑکھڑانے لگتی تھی پھر وہ

سب سے بڑے افسر جی ایم صاحب کا سامنا کیسے کرے گا۔ افسروں کے سامنے اس کے ہمیشہ بلا وجہ ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔

اس نے پلٹ کر آر اینڈ آئی برانچ اور ٹیلی فون ایکس چینج میں جھانکا۔ آر اینڈ آئی برانچ کا مختصر سا عملہ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور ٹیلی فون ایکس چینج کے دوسری شفٹ کے آپریٹرز تیزی سے مختلف نمبر ڈائل کرنے، افسران کو ان کی اقامت گاہوں پر اطلاع دینے اور نماز جنازہ کا وقت بتانے میں مصروف تھے۔ اسے خیال آیا کہ اگر وہ جی ایم صاحب کے بنگلہ پر اظہارِ تعزیت کرنے اور نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے چلا جائے تو جونیئر اسٹاف کی غیر موجودگی میں اس کی اہمیت بڑھ جائے گی اور جب وہ جی ایم صاحب کے سامنے اپنی اپیل کے سلسلے میں حاضر ہوگا تو "فی الحال نہیں" لکھتے یا کہتے وقت ان کی نگاہوں میں اپنی والدہ کا جنازہ گھوم جائے گا اور وہ "منظوری دی جاتی ہے" لکھ دیں گے۔ اس خوشگوار خیال کے ساتھ ہی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر اگر بتّی سی سلگنے لگی اور اس کا سارا اندر خوشبودار دھوئیں سے بھر گیا۔

اس نے جی ایم صاحب کے بنگلے پر جانے کا تہیہ کر لیا لیکن ابھی جنازہ اٹھنے میں کافی دیر پڑی تھی اور اگرچہ اسے پتہ تھا کہ تعزیت کے لیے جانے میں تھرو پراپر چینل کے دفتری ضابطے لاگو نہیں ہوتے پھر بھی اس کا اپنے سینئر افسران سے پہلے جی ایم صاحب کے بنگلے پر پہنچ جانا مناسب نہیں تھا۔

ایک بار اس نے سوچا کہ وہ پہلے اپنے گھر چلا جائے اور کھانا کھانے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد جی ایم صاحب کے ہاں جائے لیکن اس طرح دوگنا کرایا خرچ ہوتا تھا اور پھر اسے ڈر تھا کہیں اڑوس پڑوس میں اس کا کوئی کولیگ نہ مل جائے وہ اگلے روز دفتر میں سب کو جی ایم صاحب کے بنگلے پر جانے، نماز جنازہ میں شرکت کرنے اور جی ایم صاحب سے ہم کلام ہونے کی خبر سنا کر حیرت میں ڈال دے گا اور کم از کم اس کے انچارج کی آنکھیں ضرور کھل جائیں گی جنھیں آدمی کی بالکل قدر نہیں تھی۔

وہ دفتر سے نکل کر خوشی خوشی بس اسٹاپ پر آیا اور بس میں سوار ہو کر اس چوک پر اتر گیا جہاں سے ایک سڑک جی ایم صاحب کے بنگلے کی طرف جاتی تھی۔ ابھی جنازہ اُٹھنے میں کافی دیر تھی اس لیے وہ ٹہلتا ہوا قریبی سینما ہاؤس میں آگیا اور پوسٹر اور تصویریں دیکھنے لگا۔ کافی عرصے سے اس نے فلم نہیں دیکھی تھی۔ گھر کے اخراجات پورے نہ ہوتے تھے جب بھی اس کا جی فلم دیکھنے کو چاہتا وہ کسی سینما ہاؤس کا رُخ کرتا اور " آج شب کو " والے بورڈ پر لگی سٹلز (Stills) دیکھ کر فلم کی کہانی اور موضوع کا اندازہ کر لیتا تھا۔ بعض سینما ایسے تھے جہاں باہر کھڑے ہو کر مکالمے اور گانے بھی سنائی دیتے تھے اس نے دیکھا ——— اس فلم میں ہیروئین کو نہایت غریب دکھایا گیا تھا۔ کہیں وہ جھاڑو دے رہی تھی، کہیں بوجھ اٹھا رہی تھی اور ایک تصویر میں برتن دھو رہی تھی قریب ہی مالکن جو شاید ہیرو کی ماں بھی تھی کولہوں پر ہاتھ رکھے کھڑی اسے کسی بات پر بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ ایک اور تصویر میں ہیروئین ایک بہت بڑے شاپنگ پلازا میں ششدر کھڑی تھی اس کے سامنے رنگا رنگ ملبوسات بکھرے پڑے تھے وہ پریشان ہو گیا وہ یہاں کیسے آگئی۔ لیکن پھر اس کی نظر ایک اور تصویر پر پڑی وہ خوش شکل ہیرو کے ساتھ کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ فلم شروع ہو چکی تھی اور بند دروازوں سے چھن چھن کر موسیقی میں لپٹی ہیرو اور ہیروئین کے گانے کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں شاید یہ اسی سین کا گانا تھا۔

اس نے بہت سی تصویروں پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور ہیرو ہیروئین کی شادی کی تصویر ڈھونڈنے لگا۔ ایک تصویر میں ہیروئن کو دُلہن بنایا جا رہا تھا۔ بیک گراؤنڈ میں جھونپڑی نما مکان اور معمولی قسم کے لوگ نظر آرہے تھے شاید امیر کبیر دولہا کی برات آنے والی تھی۔ اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور باہر آگیا وہ سوچ رہا تھا اس کی ترقی ہو گئی اور اس کی تنخواہ میں اضافہ ہو گیا تو وہ ہر ماہ کم از کم ایک فلم ضرور دیکھے گا کبھی کبھی بیوی کو بھی ساتھ لے آیا کرے گا۔ اسے جی ایم صاحب کی والدہ کا خیال آیا یقیناً وہ نیک عورت تھی جس نے مر کر اسے جی ایم صاحب کی نظروں میں آنے اور اپیل منظور ہو جانے

کا موقع بخشتا تھا اسے جی ایم صاحب پر بھی ترس آنے لگا ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ ماں کو نہیں مرنا چاہیئے خواہ کسی کی ماں ہو، ماں مرجائے تو لگتا ہے زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی اور آدمی خلا میں معلق رہ گیا۔

باہر آکر اس نے چنے خریدے، نل سے پانی پیا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوبارہ اس سڑک پر آگیا جو جی ایم صاحب کے بنگلے کی طرف جاتی تھی۔ اچانک ایک بس گھوڑا گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ گاڑی بان بس ڈرائیور کو گندی گالیاں دیتا ہوا مریل گھوڑے کو بری طرح پیٹنے لگا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر بڑے سے کھرنڈ سے خون بہنے لگا وہ لمحہ بھر کے لیے گھوڑے کی جگہ جُت گیا اور چابک کھانے اور درد سے بلبلانے لگا لیکن پھر یہ جان کر کہ وہ تو مزے سے فٹ پاتھ پر جا رہا ہے وہ سگریٹ سُلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

سڑک کے دونوں جانب اونچے اونچے خوب صورت درخت تھے جن کے تنوں کو سفید رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا۔ آس پاس پھول پودے اور ہری بھری گھاس تھی۔ اس نے جی ایم صاحب کا بنگلہ نہیں دیکھا تھا لیکن اسے اندازہ تھا ویسے بھی شادی بیاہ اور ماتم والا گھر تلاش کرنا مشکل نہیں ہوتا تھا۔

ایک جگہ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ یقیناً یہ جی ایم صاحب کا بنگلہ تھا ——— بنگلے کے باہر کاریں اور جیپیں اس طرح کھڑی تھیں جیسے میلہ مویشیاں میں لاتعداد مویشی کھڑے ہوں چند ایک کاروں کو پہچان کر اسے اطمینان ہوگیا کہ وہ وقت سے پہلے نہیں آگیا۔

گیٹ سے اندر بہت بڑا لان تھا جس میں خوب صورت شامیانے لگے تھے اور نہایت عمدہ قسم کی کرسیاں بچھی تھیں مگر زیادہ تر لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے اِدھر اُدھر کھڑے باتیں کر رہے تھے وہ جس طرف سے گزرتا سلام کے لیے اس کا ہاتھ خود بخود اٹھ جاتا لوگ اسے چونک کر دیکھتے یا شاید اسے ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے اس کا سلام کرنا ناگوار گزرا ہو۔ اسے فکر دامن گیر تھی کہ وہ جی ایم صاحب سے اظہارِ تعزیت کیسے کرے گا یوں اس نے احتیاطاً جملے سوچ رکھے تھے۔

"اللہ کا حکم سر"

"رب کی رضا سر"

"صبر کریں سر"

لیکن اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ یہاں رسمی اظہارِ افسوس کی ضرورت تھی نہ گنجائش، جو آتا تھا خاموشی سے بیٹھ جاتا تھا یا دوسروں سے محوِ گفتگو ہو جاتا تھا۔ اس نے دیکھا جی ایم صاحب بہت مصروف تھے کبھی اندر جاتے کبھی باہر آتے تھے۔ اُسے ان کے قریب جانے کی ہمت نہ ہوئی تاہم وہ ایسی جگہ کرسی رکھ کر بیٹھ گیا جہاں سے آتے جاتے ان کی نظر اس پر پڑ سکتی تھی۔

پھر اس کی نظر اپنے سینئر افسر پر پڑی پھر اس سے سینئر افسر پر۔ اُسے لگا جیسے وہ اس کی جرأت پر حیران ہوں اور اندر ہی اندر غصّے میں کھولتے اس کی جواب طلبی کی ڈکٹیشن دے رہے ہوں۔

وہ بہت ہی مرعوب کر دینے والی اور دل و دماغ کو شل کر دینے والی نظروں سے بچنا چاہتا تھا لیکن کہیں جائے امان نہ تھی اور اگر کہیں تھی تو جی ایم صاحب کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کا احتمال تھا۔ اس نے پریشان ہو کر نظریں جھکا لیں اور اپنے سامنے اور آس پاس چلتے پھرتے لوگوں کے جوتوں اور ایڑیوں پر نظریں گاڑ دیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا قد سکڑ کر بالشت بھر رہ گیا ہے یا لان میں موجود لوگ اچانک دیو قامت ہو گئے ہیں۔ وہ چاروں طرف سے بہت سے بڑے بڑے لوگوں اور انیس[19]، بیس[20]، اکیس[21] اور بائیس[22] گریڈ والے افسروں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ آئی جی ہے وہ ایم ڈی ہے یہ سی اے ہے وہ ڈی جی ہے۔ اسے یہ دیکھ کر ندامت ہوئی کہ اس کے آس پاس بڑے بڑے لوگ کھڑے تھے اور وہ مزے سے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اپنی عقل پر اس کا ماتم کرنے کو جی چاہا۔ وہ کرسی چھوڑ کر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا مگر ٹہلتے اور باتیں کرتے ہوئے لوگ خود بخود اس کے قریب آجاتے پھر اسے چونک کر دیکھتے جیسے اتنے چھوٹے قد کا آدمی انھوں نے پہلی بار دیکھا ہو۔

کاش وہ اپنے کسی کولیگ کو ساتھ لے آیا ہوتا ——— اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ شاید اسے کوئی اپنے قد کا آدمی مل جائے مگر وہاں سب نوگزے تھے۔ اس کا دل ڈوبنے سا لگا کہیں اس نے یہاں آ کر غلطی تو نہیں کی۔ اگر جی ایم صاحب اسے دیکھ لیں ——— ایک بھرپور نظر ——— نہ بھولنے والی ——— تو وہ چپکے سے اٹھ کر واپس چلا جائے۔

تھوڑی دیر میں اور بہت سے لوگ آ گئے۔

گیٹ کے باہر کاروں کی تعداد اور بڑھ گئی۔ لان میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ اسی لمحے کچھ لوگوں کو ڈرائنگ روم میں جانے کی دعوت دی گئی وہ اندر جانے والوں میں شامل ہو گیا وہ زیادہ نظروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے صرف جی ایم صاحب کی ایک بھرپور نظر کا انتظار تھا۔ ڈرائنگ روم میں گنتی کے چند لوگوں میں اس کے امکانات قوی تر تھے۔

سجا سجایا ڈرائنگ روم اس کے دو کمروں کے کوارٹر سے زیادہ کشادہ اور نہایت خوب صورت تھا کھڑکیوں کے بیش قیمت اور نفیس پردے، خوشنما قالین اور عالی شان صوفے دیکھ کر اندر داخل ہوتے ہوتے اسے جھجک محسوس ہونے لگی۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی شاید بیٹھنے کے لیے معمولی قسم کی کرسی، اسٹول یا مونڈھا مل جائے مگر اسے گدے دار صوفے پر بیٹھنا پڑا۔ تھری سیٹر صوفے پر اس سمیت چار آدمی بیٹھے تھے شاید اس نے کچھ بھی جگہ نہیں گھیر رکھی تھی۔

اس نے دیکھا کارنس پر بڑی بڑی خوب صورت ٹرافیاں، میڈل اور سجاوٹ کی چیزیں پڑی تھیں۔ دروازے کے سامنے باریک تاروں میں پروئی ہوئی مچھلیاں معلق تھیں۔ ہوا کے جھونکوں سے بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کے پیچھے لپکتی تھیں۔ اسے لگا کہ تیرتے تیرتے اس کے پَر اور گلپھڑے تھک گئے ہیں اور اپنا بڑا سا منہ کھولے شارک اس کے پیچھے لپکتی چلی آ رہی ہے لیکن پھر اسے یہ جان کر اطمینان ہو گیا کہ بڑی اور چھوٹی مچھلیوں کے درمیان فاصلہ کم نہیں ہوتا تھا اور وہ آپس میں ٹکراتی نہیں تھیں۔ اسی لمحے ساتھ والے کمرے

سے کسی نے ڈرائنگ روم میں جھانکا ——— !

اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

وہ تعظیماً کھڑا ہو جانا چاہتا تھا کہ وہ پردے کے پیچھے چلی گئی مگر پردے کے نیچے سے دیر تک اس کے سفید اور اجلے پاؤں نظر آتے رہے۔ اس نے سامنے پھیلے ہوئے اپنے پاؤں پیچھے ہٹا لیے۔ اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ اس کے پاؤں اس قدر مٹیالے اور بھدّے تھے۔

پھر اس کی نظر وال کلاک پر پڑی۔ اتنا بڑا، خوب صورت اور انوکھے ڈیزائن کا کلاک اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا کیا پتہ وہ ماسٹر کلاک ہو۔ اس نے سُنا تھا کہ مختلف کمروں میں لگے ہوئے کلاک ماسٹر کلاک سے کنٹرول ہوتے ہیں سب کے الارم ایک ساتھ بجتے ہیں اور سب کی سوئیاں ماسٹر کلاک کے تابع ہوتی ہیں اس نے یہ بھی سُنا تھا کہ ماسٹر کلاک پر وقت عموماً درست ہوتا ہے لیکن اگر کبھی وقت ماسٹر کلاک سے آگے نکل جاتا یا پیچھے رہ جاتا ہے تو ماتحت کلاک بھی غلط وقت بتانے لگتے ہیں۔

اچانک جی ایم صاحب اندر آگئے اور اس کی طرف دیکھے بغیر ہوا کے جھونکے کی طرح دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔

اس نے دیکھا۔

شام ہونے کو تھی ——— پہاڑی لڑکی اپنی بھیڑوں کو ہانکتی ہوئی گھر جا رہی تھی اس کے ہاتھ میں زیتون کی شاخ تھی اور اس کے ہمراہ اس کے وفادار کتّے ——— چاروں طرف سبزہ تھا تھوڑے فاصلے پر گھنا جنگل، عقب میں نیلی نیلی پہاڑیاں۔ اسے خیال آیا اگر کوئی بھیڑیا یا چیتا حملہ کر دے تو؟ اس نے پہاڑی لڑکی سے پوچھا۔

"تمھیں ڈر نہیں لگتا؟"

"لگتا ہے۔" وہ بولی "لیکن پہلے مجھے ڈر نہیں لگتا تھا۔ میرے کتّے شیر سے زیادہ بہادر، چیتے سے زیادہ پھرتیلے اور بھیڑیئے سے زیادہ خوں خوار تھے۔ میرا بھائی قریب ہی لکڑیاں کاٹتا تھا اس کے کلہاڑے کی دھمک سے جنگل گونجتا تھا اور اس کی للکار سن کر

جانور سہم جاتے اور پرندے پھڑپھڑا کر درختوں سے اڑ جاتے تھے لیکن پھر میں اپنی بھیڑوں، وفادار کتّوں اور نیلی پہاڑیوں سمیت تصویر میں قید ہو گئی۔ اب میری بھیڑیں خاموش ہیں، کتّے ساکت اور بھائی کے کلہاڑے کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔

اس نے چونک کر دیکھا سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر اطمینان سے بیٹھے تھے مگر وہ کھڑا اتھا۔ جی ایم صاحب کے کمرے میں آنے اور لوٹ جانے کے بعد وہ اب تک کھڑا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ وہ جلدی سے پھر صوفہ میں دھنس گیا۔

میت کو لان میں لایا گیا تو سب لوگ باہر آ گئے اور نمازِ جنازہ کے لیے صفیں بنانے لگے ـــــ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اس ہجوم میں جی ایم صاحب کو ڈھونڈھ نکالے اور نمازِ جنازہ پڑھتے ہوئے ان کے قریب کھڑا ہو مگر وہ اسے نہ مل سکے۔ بار بار اپنے دوسرے سینئر افسران سے اس کا سامنا ہو جاتا۔

دعا کے بعد وہ لپک کر آگے بڑھا اور جنازے کو کندھا دینے والوں میں شامل ہو گیا۔ دو ایک بار جی ایم صاحب قریب آئے مگر انھوں نے اسے نہیں دیکھا۔

بہت سے لوگ نماز جنازہ پڑھ کر رخصت ہو گئے تھے اس کا خیال تھا اب تھوڑے لوگوں میں وہ اسے ضرور دیکھ لیں گے اور یاد بھی رکھ سکیں گے لیکن وہ دوسری جانب کندھا دے کر پیچھے ہٹ گئے اور سر جھکا کر جنازے کے پیچھے چلنے لگا۔

چند ایک بار اس کی جگہ بدلی گئی مگر وہ پھر اس خیال سے اپنی جگہ پر واپس آ جاتا کہ شاید وہ اس کی جگہ لینے آئیں تو ان سے آنکھیں چار ہو جائیں لیکن ڈیڑھ دو میل چلنے کے بعد بھی انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔

قبرستان پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا اور کچھ فاصلے سے ایک دوسرے کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔

دفتر سے نکلے اب اسے تقریباً پانچ گھنٹے ہو چلے تھے اسے اپنے پانچ گھنٹے ضائع ہوتے نظر آ رہے تھے تاہم اس نے ہمت نہیں ہاری اور میّت کو لحد میں اتارتے، مٹی ڈالتے اور گلاب کا عطر چھڑکتے وقت بھی وہ پیش پیش رہا اور مسلسل دیکھتا رہا کہ وہ اسے دیکھتے ہیں یا نہیں۔

اس کے دوسرے سینئر افسران میں سے بہت سے اب بھی موجود تھے اور مسلسل ان کی کارکردگی کا نوٹس لے رہے تھے مگر انھیں درخواست فارورڈ (Forward) کرنا تھی۔ آخری فیصلہ جی ایم صاحب کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔

پھر قبرستان کے باہر کاروں کی قطار لگ گئی ان میں شاید جی ایم صاحب کی ایئر کنڈیشنڈ کار بھی تھی۔

دعا کے بعد جی ایم صاحب بلند قامت لوگوں کے ہمراہ کار کی طرف چلے گئے اور وہ گم صم قبر پر کھڑا رہ گیا۔

لیکن پھر ایک شخص جو گورکنوں کو پیسے دے رہا تھا اس کی طرف آیا اور اس کے ہاتھ پر پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیا۔

اس کا جی چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اگر وہ دفتر میں اوور ٹائم کام کرتا تو بھی اتنے ہی پیسے بنتے اس نے پانچ روپے کا نوٹ جیب میں ڈالا اور ایک طرف چل دیا۔

خواہشیں سراب ہیں

کیا کہا کتنے برس ؟

برس نہیں دن ہوں گے شاید آپ کو غلطی لگی ہے ابھی ابھی تو میں پنگھوڑے میں لیٹا منہ سے بوتل لگائے بڑے مزے سے دودھ پی رہا تھا اور وہ عورت جس کے بطن سے میں نے جنم لیا ابھی ابھی یہاں تھی آپ میری بات پر یقین کیجیے ۔ میں بالکل سچ کہتا ہوں ۔ میں نے ابھی چند روز ہوئے زندگی کی ابتدا کی ہے یقیناً آپ کو مغالطہ ہوا ہے ۔ مہربانی کر کے ذرا پڑتال کر لیجیے ۔ وقت کے سلسلے میں ہمیشہ مجھ سے ناانصافی ہوتی رہی ہے مجھے یاد ہے ایک بار میں امتحان کا پرچہ دے رہا تھا اور ابھی میں نے اپنا رول نمبر ہی لکھا تھا کہ ممتحن کی گرجدار آواز سنائی دی "ہاف دی ٹائم از اوور"

اس کے بعد مارے گھبراہٹ کے میں کچھ بھی نہ لکھ سکا ۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اب پھر !!

غالباً آپ نے وہ سب مہ و سال بھی میرے کھاتے میں ڈال دیئے ہیں جنھیں میں نے خود نہیں گزارا وہ خود مجھے روندتے ہوئے گزرے ہیں لیکن آپ کو دیکھنا ہو گا کہ ان شب و روز میں سے کتنے میرے حصے میں آئے اور کتنے ایسے تھے جنھیں میں نے خود کو کرائے پر چڑھا کر بسر کیا ۔ جن

شب و روز نے مجھے زندگی میں کوئی لذت یا خوشی نہیں دی انھیں میرے کھاتے میں ڈالنا ہرگز درست نہیں۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ سب شب و روز جو ایک جیسے تھے اور ان گنت تھے انھیں ایک ہی شمار کیا جائے اور ان سب برسوں کو بھی میرے حساب میں شمار نہ کیا جائے جو میں نے لوگوں اور چیزوں کے نام یاد کرنے میں صرف کیے۔ یہ چیونٹی ہے، وہ بادل ہے، یہ پنکھا ہے، وہ تختی ہے۔ پھر مجھے الف سے انار اور ب سے بکری رٹنے کی تلقین کی گئی۔ حالاں کہ جب انار اور بکری موجود تھے تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ انار کو بکری اور بکری کو انار کہا جاسکتا لیکن میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی ساری چیزوں کے نام رکھ دیئے گئے تھے اور میرے لیے ضروری قرار دیا گیا تھا کہ میں ان ناموں اور اصولوں کو ازبر کروں اور ان سے سرِمُو اِدھر اُدھر نہ ہوں۔

انار اور بکری کے بعد بھی برسوں مجھے لوگوں اور چیزوں کے نام یاد کرنا پڑتے اور میرے قیمتی دن، مہینے اور سال بکریوں، گھوڑوں، تختیوں اور بادلوں کی نذر ہو گئے اسی طرح ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے سب کی شکلیں ایک جیسی تھیں بہت تھوڑا تھوڑا فرق تھا اور بظاہر یہی لگتا تھا کہ ایک ہی آدمی بھیس بدل کر ہر جگہ گھومتا پھرتا ہے۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ انھوں نے ایک دوسرے کے الگ الگ نام رکھے ہوئے تھے اور مجھے یہ نام یاد کرنا پڑے نہ صرف نام بلکہ ناموں کے ہجے، ہجوں کی مخصوص شکلیں، آوازیں، زیریں زبریں پیشیں!!

مجھے نہایت افسوس ہے میں اس فیصلے کو نہیں مانتا۔

میرے ساتھ ہمیشہ زیادتی کی گئی ہے یہاں تک کہ میرے پیدا ہونے میں بھی میرا عندیہ معلوم نہیں کیا گیا۔ سارے فیصلے مجھ پر ہمیشہ ٹھونسے گئے ورنہ اگر میری اپنی پسند اور میری مرضی کو دخل ہوتا تو میں خود فیصلہ کرتا کہ میں کس صدی میں کہاں اور کن لوگوں کے درمیان پیدا ہونا چاہتا ہوں لیکن والدین کے انتخاب سے لے کر رنگ، نسل اور عقیدے کے انتخاب تک میرا اپنا کوئی

چوائس نہ تھا۔ میرا قد، شکل وصورت اور آنکھیں جن کی وجہ سے بعد میں کئی طرح کی پیچیدگیاں اور مشکلیں پیدا ہوئیں میرا انتخاب بالکل نہیں تھیں۔ میں جس گھر میں پیدا ہوا اس سے بہتر اور روشن گھر اور بھی موجود تھے۔ میرے والدین سے بہتر لوگ میرے والدین ہوسکتے تھے اگر میں منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتا تو مجھے بہت سے کام کیے کرائے مل جاتے اور میرا بہت سا وقت بچ جاتا لیکن مجھے رشتہ دار بھی بنے بنائے ملے —— یہ بدمزاج اور بدصورت آدمی میرا ماموں ہے۔ یہ تین آدمیوں کی خوراک ایک وقت میں کھا جانے والا حریص شخص میرا چچا ہے۔ یہ چڑیل صورت عورت میری پھوپھی ہے اور یہ بھوکی بلّی کی طرح ہر وقت میاؤں میاؤں کرنے والی عورت میری خالہ ہے ان سب کا کام میرے راستے میں روڑے اٹکانا، میری کامیابیوں پر حسد کرنا اور ناکامیوں پر بغلیں بجانا تھا۔ میں زندگی بھر نیکیوں کی گٹھڑیاں اٹھائے ہر ایک دروازے پر دستکیں دیتا رہا مگر مجھے نفرت اور حسد کے سوا کچھ نہ ملا۔

مجھے اپنے محدود اور مخصوص ماحول سے دوستوں کا انتخاب کرنا پڑا۔ میں انھیں باری باری سالہا سال تک آزماتا رہا اور ناکامی کا منہ دیکھتا رہا۔ وہ مصیبت کے وقت کام آنے کے اصول پر اس قدر سختی سے کاربند رہے کہ میرے کام آنے کے لیے وہ مجھے ہر خوشی سے محروم رکھنے اور اپنے احسانات کے بوجھ سے کچلنے کی کوشش کرتے رہے۔ میں نے زندگی کا بہت سا حصہ انھیں آزمانے پر صرف کر دیا آخر اتنے بڑے نقصان کی کچھ تو تلافی ہونی چاہیے۔

ماحول کے انتخاب میں بھی میری پسند شامل نہیں تھی۔ میں جس گلی میں چلتا وہ آگے جا کر بند ہو جاتی۔ سارے راستے گھوم پھر کر واپس آجاتے۔ میں نے اپنے اور ماحول کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اتنا تنگ اور سخت تھا کہ میں بار بار اس کی خلاف ورزی کے جرم میں پکڑا جاتا اور تنہائی کے زنداں میں ڈال دیا جاتا۔ ادھر میرے پیدا ہونے

سے پہلے ہی ساری اچھی اور خوب صورت چیزوں پر لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ مجھے جو چیز بھی پسند آتی اس پر پہلے سے کسی اور کے نام کی مہر لگی ہوتی۔ میں جس سکول میں پڑھنا چاہتا تھا اس میں مجھے داخلہ نہ ملا۔ میں جو پیشہ اختیار کرنا چاہتا تھا اس میں میرے لیے کوئی گنجائش نہ نکلی۔ میں جو چیز ایجاد کرنا چاہتا تھا وہ لوگوں نے میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ایجاد کر لی تھی۔ میں جو کچھ سوچتا وہ کہیں نہ کہیں پہلے سے سوچا جا چکا ہوتا۔ یہاں تک کہ مجھے جو لڑکی پسند آئی وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنے پیدا ہونے والے بچوں کی صورتیں نظر آنے لگتیں اور ان کی کلکاریاں سنائی دینے لگتیں۔ ہم ایر کنڈیشنڈ ریسٹورینٹ کے خوب صورت کیبن میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں سامنے رکھے گھنٹوں باتیں کرتے۔ وہ بہت کم کھاتی تھی۔ میرا جی چاہتا کہ وہ میری منگائی ہوئی ساری چیزیں چٹ کر جائے میرا تو یہ بھی جی چاہتا میں خود چائے کی پیالی میں حل ہو کر گھونٹ گھونٹ اس کے حلق سے اتر جاؤں۔ وہ اکثر کہتی:

"آپ بہت اچھے ہیں بالکل امجد کی طرح دلچسپ اور پُر لطف باتیں کرتے ہیں۔ میں آپ کو امجد سے ملاؤں گی۔ آپ ہماری شادی پر آئیں گے نا۔"

میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ امجد سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میری شادی راشدہ کے بجائے عذرا سے ہو گئی تاہم میرا خیال تھا میں نے عذرا سے شادی کر کے اپنے بہت سے مسائل حل کرنے کے لیے ایک چھلانگ لگائی ہے اور واقعی میرے بہت سے مسائل حل بھی ہو گئے لیکن ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا کیوں عذرا! تم خود کچھ نہیں کہو گی؟

"میں بے حد شرمندہ ہوں ڈارلنگ کی شادی کے چند ہی دنوں بعد میرے وجود سے فالتو اور مصنوعی چھلکے ایک ایک کر کے اترنے لگے اور میرے اندر سے چیختی چلاتی بات بات پر روٹھتی، الزام تراشیاں کرتی، طعنے مہنے دیتی اور اپنے میکے کی امارت و ثروت کی دھونس جماتی اصلی اور خالص عذرا نکل آئی۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ تمھیں ایک خوب صورت بچّے کی شدید خواہش تھی لیکن مجھے بچّوں کے خیال ہی سے گھن آتی تھی۔ ایک بار تم نے میرے ساتھ دھوکہ کیا تھا لیکن میں نے ایک ماہر دایہ کی خدمات حاصل کر کے تمھارا دھوکہ جلد ہی تمھیں لوٹا دیا تھا۔ اس کے بعد، مجھے یاد ہے تم اور زیادہ اداس رہنے لگے تھے اور تمھاری اداسی دیکھ کر مجھے تمھارے بھاگ جانے اور چوری ہو جانے کا خوف اور زیادہ لگنے لگا تھا اور حالاں کہ میں نے تمھارے گلے میں جہیز کا طوق اور پاؤں میں بھاری حق مہر کی بیڑیاں ڈال رکھی تھیں اور ایجاب و قبول کے الفاظ کی کھونٹیاں گاڑ کر تمھارے چاروں طرف اپنے وجود کا خیمہ مضبوطی سے گاڑ لیا ہوا تھا۔ پھر بھی مجھے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ تم میری حراست سے فرار نہ ہو جاؤ۔"

آپ نے دیکھا میں برسوں عذرا کی قید میں رہا ہوں۔ اگر اسیری کے ان برسوں کو میری عمر سے منہا نہ کیا گیا تو یہ بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔ ہاں یہ درست ہے کہ فرار ہونے کے لیے چور راستے بھی ہوتے ہیں اور میں ہر رات عذرا کے پہلو میں اپنے جسم کی کینچلی چھوڑ کر فرار ہو جاتا لیکن میں کہیں دور نہیں جاتا تھا۔ وہ ماں بیٹا مجھے اپنے بیڈ روم کے سامنے والی دیوار میں نظر آتے تھے۔

جب کبھی میں تنہا ہوتا یا عذرا محوِ خواب ہوتی۔ وہ عورت مجھے اپنے کم سن بچّے کے ساتھ ایک ٹیلے پر کھڑی نظر آتی۔ وہ ایک ایسا نغمہ تھی جس میں بیک وقت کیفیت و انبساط اور رنج و محن کے جذبات پیدا کرنے کی تاثیر تھی۔ اسے دیکھ کر میں کبھی خوشی کے ترو تازہ ٹھنڈے میٹھے پانیوں میں غوطے لگاتا۔ کبھی اداسیوں کے لق و دق صحرا میں پیاس کے مارے ایڑیاں رگڑتا۔

کبھی کبھی میں اٹھ کر دیوار کے پاس چلا جاتا تو بچّہ مجھے دیکھ کر ماں کی گود میں چہکنے اور کلکاریاں مارنے لگتا۔ پھر جب میں بچّے کو پیار کر رہا ہوتا وہ عورت پاس ہی کھڑی ہم دونوں کو ممتا اور محبت سے لبریز نظروں سے دیکھتی اور اپنی پھٹی پرانی اوڑھنی سے خوشی کے آنسو پونچھتی۔ اس کا تار تار

لباس اور جسم پر جا بجا خراشوں کے نشان ویرانے کی صعوبتوں کی غمازی کرتے
پھر دوسرے کسی خوں خوار درندے کی آواز سنائی دیتی تو وہ خوف زدہ ہو کر
مجھ سے لپٹ جاتی۔ اسی لمحے عذرا کی چیخ جیسی آواز گھر بھر میں گونجتی اور میرے
ہونٹ جو ابھی ابھی محبت کے زمزم سے تر ہوتے اچانک خشک ہو جاتے اور
منہ میں ریت بھر جاتی۔

اس عورت کو دیکھ کر میرا جی چاہتا کاش میں اس کے بطن سے جنم لے سکتا۔
کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ شاید وہ عورت میری اصلی ماں تھی میں جس کے بطن
سے جنم نہیں لے سکا تھا اور وہ بچہ شاید میں خود تھا۔

آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ عذرا کی معیت میں گزارے ہوئے ماہ و سال
کسی طرح بھی میرے اپنے نہیں تھے اور انھیں میرے حساب میں ہرگز شمار
نہیں کرنا چاہیے۔ سوائے ان چند لمحوں کے جب جب میں نے اس کے
پہلو میں لیٹے لیٹے ٹیلے پر کھڑی عورت کے کم سن اور خوب صورت بچے کو
پیار کیا۔

اور آپ کو اس بات کا اندازہ بھی ہو گا کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو
ساری اچھی جگہوں، خوب صورت آبادیوں اور برمحل شاپنگ سنٹروں کی الاٹمنٹیں
ہو چکی تھیں اور لوگوں نے ہر جگہ اپنے اپنے نام کی تختیاں آویزاں کر رکھی تھیں۔
مجھے جو مکان بھی رہنے کے لیے پسند آتا وہ کسی دوسرے کی ملکیت ہوتا۔ مجھے
اپنی مرضی اور پسند کے خلاف کام کرنا پڑتا۔ ایسا کام جس سے مجھے نفرت
ہوتی۔ میں ہر روز ایک ہی طرح کا کام کر کر کے اُکتا جاتا اور میں ہر روز ایسے
افسروں کی شکلیں دیکھتا جن کی صورتوں سے مجھے گھن آتی تھی۔ میں اُنھیں
سلام کرنے ان کی ہاں میں ہاں ملانے اور ان کے احکامات بجا لانے کی
اذیتیں اٹھاتا۔ میں اپنے جائز حقوق کے لیے آواز اٹھاتا تو مجھے بتایا جاتا کہ
مجھے میری صلاحیتوں کے مطابق معاوضہ ملتا ہے لیکن میرے ذہن میں ہر

وقت یہ سوال کلبلاتا رہتا کہ مجھے بہتر صلاحیتیں کیوں ودیعت نہیں کی گئیں۔
مجھے ایسے لوگوں کے درمیان زندگی کے قیمتی دن بسر کرنا پڑے جو کسی نہ کسی چیز کے مالک بننا چاہتے تھے۔ جس کے ہاتھ جو چیز آجاتی تھی وہ اس پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا تھا۔ زمین کے ہر ٹکڑے پر، ہر دفتر اور ہر کارخانے میں اژدہے پھنکارتے تھے۔ دکانوں، مکانوں، ہوٹلوں، ریستورانوں، اخباروں، بسوں، کاروں یہاں تک کہ درختوں اور ان کے سایوں پر بھی کسی نہ کسی زہریلے سانپ کا پہرا تھا۔ ہوا، پانی اور روشنی پر بھی قبضہ ہو چکا تھا اور راشن مقرر ہو چکا تھا۔ شہر میں خوشیوں، آسانیوں اور زندگی کی سہولتوں کا قحط نہیں تھا لیکن سب پر ملکیت کی مہر لگی ہوئی تھی اور یہ سب ایسے لوگوں کے قبضے میں تھیں جو شاید زیادہ انسان تھے۔ غلامی، ذلت اور اذیت کے ان برسوں کو میرے حساب میں ڈالنا قطعاً قرینِ انصاف نہ ہوگا۔

"دی ٹائم از اوور۔"

نہیں پلیز۔ آپ کو یقیناً مغالطہ ہوا ہے ابھی تو میں نے زندگی کے پرچے کی ابتدا کی ہے۔ ابھی تو میں نے صرف چند سطریں لکھی ہیں۔ اگر آپ نے اپنے اعلان کی تصحیح نہ کی تو مارے گھبراہٹ کے میں کچھ نہ لکھ سکوں گا اور پاس مارکس بھی حاصل نہ کر سکوں گا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک بار پھر سے وقت اور پرچے کی ابتدا کی جائے۔ ویسے بھی جو چند سطریں میں نے گھبراہٹ میں لکھی ہیں وہ ٹیڑھی میڑھی ہیں۔ الفاظ لکھ لکھ کر جگہ جگہ سے کاٹے ہوئے ہیں اور ان کے ہجے بھی درست نہیں۔ آئی ایم ویری سوری سر کہ میں اب تک رف کرتا رہا ہوں، اگر مجھے ایک بار اور نئی کاپی دے دی جائے تو میں اسی پرچے کو نہایت صاف اور خوشخط لکھ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے

تجربے سے فائدہ اٹھانے کا ایک اور موقع ملنا چاہیے۔ صرف ایک بار اور
نئی کاپی دے دیجیے۔ صرف ایک چانس اور — پلیز!!
"دی ٹائم از اوور" "ٹائم از اوور"!

بوکا

تپش اُگلتی زمین۔ مضبوطی سے گڑے ہوئے حبس کے خیمے۔ شکر دوپہر رات، ہر طرف گہرا ہولناک سناٹا۔ رات کا کوئی پا بہ زنجیر لمحہ۔

گھمس گھمس گھمس — پیاس پیاس پیاس!

عجیب خوفناک رات ہے جس کی بھی آنکھ تھوڑی دیر کے لیے لگتی ہے وہ ایک ہی جیسا ڈراؤنا خواب دیکھ کر ہڑبڑا اٹھتا ہے۔

کیا دیکھتا ہوں ایک تاریک اور گہرا کنواں ہے جس کے اِرد گرد بہت سے لوگ جن کی صورتیں دھند اور تاریکی میں پہچانی نہیں جا رہی ہیں کھڑے ہیں۔ وہ باری باری کنویں کے اندر جھانکتے اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اپنی باری آنے پر — میں اندر جھانکتا ہوں — اندر — باہر سے زیادہ خاموشی اور تاریکی ہے۔ مجھے پانی دکھائی نہیں دیتا مگر اس کے خیال سے میری پیاس اور بھڑک جاتی ہے میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں اور اپنے پیاسے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا ہوں۔ ان میں سے ایک بار بار کھنکارتا، تھوک سے گلا تر کرتا اور کہتا ہے۔

"کچھ کرو — ورنہ سب پیاس سے مر جائیں گے۔"

"کیا کریں؟"

"ایک بار اور کنڈا ڈال کر دیکھو —— شاید مل ہی جائے۔"

"نہیں ملے گا —— ہم کنڈا ڈال ڈال کر تھک گئے ہیں۔"

"کسی غوطہ خور کو بلواؤ۔"

"بلوایا تھا۔"

"پھر؟"

"اس نے کہا تہہ میں کیچڑ اور دلدل ہے اسے ڈر لگتا ہے۔"

"پھر کیا کریں؟"

"کوئی ہمت کرے اور جا کر نکال لائے۔"

"نہیں —— پہلے یہ پتہ چلاؤ یہ بار بار پھینک کون دیتا ہے؟"

"یہ بعد میں پتہ چلائیں گے۔"

"ہاں ہاں پہلے نکالنے تو دو۔"

"کچھ فائدہ نہیں —— پہلے یہ پتہ چلانا چاہیے کہ بار بار پھینک کون دیتا ہے۔"

"چپ کرادے —— پہلے نکالنے تو دے۔"

"ہاں پہلے نکال کر پیاس بجھانی چاہیے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔"

"کوئی ہے جو اترے؟"

"کوئی ہے؟"

"کوئی ہے؟"

"کوئی نہیں —— ہم سب پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائیں گے۔"

"میں ہوں۔" ایک طرف سے آواز آتی ہے۔

"تم!"

" ہاں ہیں ـــــ میں جاؤں گا اور نکال کر لاؤں گا۔"

میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن آواز میرے حلق میں پھنس جاتی ہے ۔ وہ کنویں کی منڈیر سے رسّی باندھتا اور مضبوطی سے گرہ لگاتا ہے سب حیرت اور خوشی کے ملے جُلے جذبات سے اسے دیکھتے ہیں وہ رسّی ہاتھ میں لے کر کنویں میں اترتا ہے مَیں تھوک نگل کر گلا تر کرتا ہوں اور کانپتی ہوئی آواز میں کہتا ہوں ۔

" یہ کیا کر رہے ہو ابّا ؟"

وہ کہتا ہے

" مجھ سے لوگوں کی پیاس نہیں دیکھی جاتی ۔ میں نکال کر لاؤں گا ۔"

" بوکا نہیں ملے گا ابّا ـــــ تم خود کھو جاؤ گے ۔"

" تم فکر نہ کرو " وہ کہتا ہے " میں ڈوب نہیں جاؤں گا بوکا ڈھونڈ کر جلد واپس آجاؤں گا ۔"

مَیں اسے آوازیں دیتا رہتا ہوں مگر وہ نہیں رُکتا ۔ رسّی تھامے آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا جاتا ہے اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔ اس کی آواز اور آہٹ دور ہوتی جاتی ہے پھر اس کے پانی میں غوطہ لگانے کی آواز سنائی دیتی ہے سب منڈیر پر کہنیاں ٹیک کر اندر جھانکتے ہیں مگر کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی مَیں گھبرا کر پکارتا ہوں

" ابّا ۔"

میری آواز دیر تک کنویں کی دیواروں پر موٹر سائیکل چلاتی رہتی ہے پھر ڈوب جاتی ہے ۔

" ڈوب گیا ہے ۔"

" کیچڑ میں پھنس گیا ہے ۔"

" مجھے پہلے ہی ڈر تھا ۔"

میں اسے آوازیں دیتا ہوں۔ وہ کوئی جواب نہیں دیتا میں کنویں میں لٹکی، بے حرکت رسّی کو دیکھتا ہوں اور میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔

میری چیخ کی آواز سن کر وہ ساتھ والی چارپائی سے اٹھ کر میرے قریب آتا اور شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا

"کیا ہوا بیٹے ـــــ خیریت تو ہے؟"

میں پسینے میں شرابور ابھی تک لرز رہا ہوں کانپتے ہاتھوں سے اسے ٹٹولتا اور پوچھتا ہوں۔

"ابّا ـــــ یہ تم ہی ہو نا ـــــ بوکا نکال لائے ہو؟"

"معلوم ہوتا ہے" وہ کہتا ہے "تم نے بھی بُرا خواب دیکھا ہے۔"

"تم نے بھی دیکھا ہے ابا؟"

"ہاں بیٹے بہت بُرا۔"

"کیا دیکھا ہے ابا؟"

"میں نے دیکھا" وہ کہتا ہے "ایک دنبہ ہے سفید سفید اون اور بھاری خوب صورت چکّی والا۔ میرے آگے آگے دوڑ رہا ہے میں چھری لیے اس کے پیچھے بھاگتا ہوں مگر اسے پکڑ نہیں پا رہا ہوں۔ جب میں ہانپ جاتا ہوں تو کہتا ہوں:

"بُزدل اللہ کی راہ میں جانے سے ڈرتے ہو؟"

میری بات سن کر وہ رُک جاتا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ گردن جھکا کر کہتا ہے" اچھا ـــــ جیسے اس کی رضا۔"

مَیں اسے زمین پر لٹاتا ہوں گردن پر چھری رکھتا ہوں اور چلانا چاہتا ہوں۔ وہ کہتا ہے:

"آنکھوں پر پٹی باندھ لو۔"

میں آنکھوں پر پٹی نہیں باندھتا اور اللہ اکبر پڑھ کر چھری چلا دیتا ہوں

اور یہ دیکھ کر میری چیخ نکل جاتی ہے کہ اس کی جگہ تم ذبح ہوئے پڑے ہو ـــــ استغفار بیٹے ـــــ اللہ تمھاری عمر دراز کرے۔"

کچھ دیر کے لیے ہم دونوں خاموش ہو جاتے ہیں وہ زیر لب کچھ پڑھ پڑھ کر میری طرف منہ کر کے پھونکنے لگتا ہے اور ابھی اس نے تیسری پھونک مارنا ہوتی ہے کہ میرا چھوٹا بیٹا ابّو ابّو پکارتا اٹھ کر بیٹھ جاتا اور رونے لگتا ہے، پھر اس کی ماں جاگتی ہے اور اسے سینے سے چمٹا کر وہ بھی رونے لگتی ہے۔ ابّا اپنی پھونکوں کا رُخ ان کی طرف کر لیتا ہے۔

وہ پوچھتی ہے "کیا وقت ہو گا؟"

"پتہ نہیں" مَیں جواب دیتا ہوں "کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ آسمان دھند میں چھپا ہوا ہے کوئی ستارہ نظر نہیں آتا جس سے وقت کا اندازہ ہو سکے۔ عجیب رات ہے۔ لگتا ہے وقت ایک جگہ پر رُک گیا ہے اور اب کبھی صبح نہیں ہو گی۔"

"کیا صبح نہیں ہو گی؟" وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

"ہو گی۔ ضرور ہو گی تم سو جاؤ۔" ابّا جواب دیتا ہے پھر کہتا ہے "ضرور کہیں کچھ ہوا ہے۔"

"کیا ہوا ہے۔" وہ اور پریشان ہو کر پوچھتی ہے۔

"کوئی انہونی بات۔ پتہ نہیں کس پر کیا گزری ہے۔ پہلے بھی ایک بار ایسا ہوا تھا۔"

"کب ـــــ کیا ہوا تھا ابّا؟"

"یہ پرانی بات ہے بیٹے ـــــ کتابوں میں لکھی ہے۔ دن چڑھے گا تو خود پڑھ لینا۔"

"دن چڑھے گا ابّا؟"

"ہاں بیٹے ـــــ ہر رات خواہ وہ کتنی ہی قیامت کی رات کیوں نہ ہو آخر کار ختم ہو جاتی ہے اور سورج نکلتا ہے صبح ہوتی ہے۔"

"اب کیا وقت ہوگا؟" وہ پھر پوچھتی ہے۔
"صبح کاذب معلوم ہوتی ہے۔"
"اور صبح صادق؟"
"صبح کاذب کے بعد صبح صادق ہوتی ہے پھر شفق پھوٹتی ہے اور سورج طلوع ہوتا ہے۔"
"مگر مرغ نے اذان نہیں دی؟"
"ہاں ــــ مرغ نے اذان نہیں دی؟ ــــ تم جاؤ ــــ جا کر دیکھو۔"
میں اٹھ کر ڈربے کے قریب آتا ہوں دروازہ کھولتا ہوں مرغ زندہ اور سلامت ہے مگر بُری طرح خوف زدہ ہے اور ہانپ رہا ہے شاید اس نے بھی کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے میں اسے پکڑ کر باہر نکالنا چاہتا ہوں مگر وہ سہمی ہوئی مرغیوں کے پَروں میں سر چھپا کر دُبک جانا چاہتا ہے میں اسے زبردستی پکڑ کر باہر نکالتا ہوں۔ اس کی گردن کو اوپر کرتا اور اسے بھینچ کر اس کے اندر سے آواز نکالنے کی کوشش کرتا ہوں مگر آواز نہیں نکلتی۔
"چھوڑ دے" ابّا کی آواز سنائی دیتی ہے" ایسے آواز نہیں نکالی جا سکتی ــــ اور نکل بھی آئے تو ایسی اذان کا کیا فائدہ؟"
مَیں مرغ کو واپس ڈربے میں دھکیل دیتا ہوں اور آکر اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہوں ابّا کہتا ہے:
"پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مرغ اذان نہ بھی دے تو بھی وقت رُکتا نہیں ہے۔"
"مجھے تو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"
"نہیں بیٹے۔ جب ہمیں وقت ٹھہرا ہوا لگتا ہے اس وقت دراصل ہم خود ٹھہرے ہوتے ہیں۔ اندر اندھیرا ہو جائے تو دن رات ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں نیکی اور بدی کی پہچان نہیں رہتی۔ عدل اور بے عدلی میں تمیز نہیں رہتی۔

مگر وقت چلتا رہتا ہے اور ہر رات کے بعد صبح کا اجالا ضرور پھیلتا اور چیزوں کی اصلی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔"

" اگر صبح نہ ہوئی تو" وہ کہتی ہے

" ایسا نہیں ہوسکتا" ابا کہتا ہے " پہلے کبھی ایسا ہوا ہے۔"

" پہلے کبھی ایسی ہولناک رات اور اس طرح کے بھیانک خواب بھی تو دکھائی نہیں دیے۔"

" اللہ خیر کرے گا ـــــ تم لوگ سو جاؤ۔"

" سو جائیں ؟ ـــــ کیوں ؟ ـــــ کس طرح ؟ ؟ ؟"

" مجھے نیند نہیں آتی" وہ کہتی ہے " اور کاکا بھی بار بار ڈر کر چونکتا ہے۔"

" مجھے بھی نیند نہیں آرہی" میں کہتا ہوں " اور ڈر بھی لگتا ہے کہیں ویسا ہی خواب ...."

" نہیں بیٹے" ابا کہتا ہے " تم سو جاؤ ـــــ میں جاگتا ہوں میں جاگتا اور پڑھتا رہوں گا تو تمھیں بُرے خواب دکھائی نہیں دیں گے۔"

اسی لمحے اچانک آہٹ سنائی دیتی ہے ہم چونک کر ڈربے کی طرف دیکھتے ہیں لگتا ہے مرغ ڈربے سے باہر نکل آیا اور اپنے پَر پھڑپھڑا کر اذان دینے کے لیے زور لگا رہا ہے مگر آواز اس کے حلق میں پھنس گئی ہے۔ زور لگاتے لگاتے وہ ہانپ جاتا اور اذان کو ادھورا چھوڑ کر ڈربے میں گھس جاتا ہے۔ جاگتے جاگتے اور حبس اور دھند کے سائبان میں ستارے تلاش کرتے کرتے ہماری آنکھیں تھک جاتی اور اعصاب شل ہو جاتے ہیں مگر روشنی اور صبح کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ لگتا ہے رات کا کوئی لمحہ ساکت ہوگیا ہے یا مرغ کے گلے میں اذان کی صورت اٹک گیا ہے۔ مگر پھر گرمی اور حبس کے باوجود نہ جانے کب اور کیسے میری آنکھ لگ جاتی ہے اور میں نیند کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہوں مگر ابھی میں نیند کے پہلے زینے پر قدم رکھتا ہوں کہ وہی ڈراؤنا خواب پھر وہیں

سے شروع ہو جاتا ہے جہاں میری آنکھ کھل گئی تھی۔

کیا دیکھتا ہوں کہ کنویں میں لٹکی ہوئی رسّی اچانک ہلنے لگی ہے میں اندر جھانکتا ہوں کان لگا کر سنتا ہوں اور کہتا ہوں۔

"وہ ابھی ڈوبا نہیں — بوکا ڈھونڈھ رہا ہے۔"

وہ جاتے جاتے پلٹ آتے ہیں اور منڈیر پر کہنیاں ٹیک کر اندر جھانکتے ہیں پانی میں اس کے چلنے اور حرکت کرنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے پھر اس کی آواز گونجتی ہے "بوکا مل گیا ہے۔"

سب خوش ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اس کی آواز پھر آتی ہے۔

"میں بوکا لے کر اوپر آرہا ہوں۔"

"مجھے پہلے ہی یقین تھا" ایک کہتا ہے "وہ خالی ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"کمال کا آدمی ہے۔"

"میں کہتا ہوں — پہلے یہ پتہ چلانا چاہیئے کہ بار بار پھینک کون دیتا ہے؟"

"چپ کر اوئے — شکر کر مل گیا ہے۔"

"کچھ فائدہ نہیں — جب تک اس کو نہ پکڑا جائے جو بار بار پھینک دیتا ہے۔"

"میں بتاؤں وہ کون ہے؟" پیچھے سے ایک شخص سب کو دھکیلتا ہوا آگے آکر کہتا ہے۔

"بتاؤ؟"

وہ نیفے میں سے چھری نکالتا ہوا میں لہراتا اور تنی ہوئی رسّی کاٹ دیتا ہے پھر ہنستا ہوا ایک طرف چلا جاتا ہے۔ دہشت اور خوف کے مارے سب خاموش رہتے ہیں۔ کنویں کے اندر سے کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔

میری چیخ کی آواز سن کر وہ — ساتھ والی چارپائی سے اٹھ کر میرے قریب

آتا اور جھک کر کہتا ہے۔

" اٹھو بیٹے ـــــ جلدی کرو ـــــ دن نکل آیا ہے۔"

" دن نکل آیا ہے ؟ "

" ہاں ۔"

" مگر ابھی ابھی تو صبح کاذب تھی ۔"

" ہاں بیٹے ـــــ آج صبح کاذب ہی کے وقت سورج نکل آیا ہے۔ پتہ نہیں اب کیسی سخر دوپہر ہمارا راستہ روکے کھڑی ہے ۔"

تماشا

اندھیرے کا طویل سفر طے کرنے کے بعد وہ سورج طلوع ہونے تک دریا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔

کنارے پر جگہ جگہ ادھ کھائی اور مری ہوئی مچھلیاں پڑی ہیں چھوٹا کہتا ہے "یہ لدھروں کی کارستانی ہے ابا۔"

"ہاں پتر" بڑا کہتا ہے "یہ ایسا ہی کرتے ہیں ضرورت سے زیادہ مچھلیاں مار مار کر جمع کرتے رہتے ہیں مگر کھاتے وقت آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور شکار کو خراب اور ایک دوسرے کو لہو لہان کر دیتے ہیں۔"

"یہ اتنی ساری مچھلیاں" ! چھوٹا کہتا ہے "ایک رات میں اتنی مچھلیاں مارتے ہیں — تو دریا مچھلیوں سے خالی نہ ہو جائے گا؟"

"اگر لدھروں کی تعداد بڑھتی رہی تو ایسا ہو سکتا ہے۔"

"وہ سامان رکھ کر کنارے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس پار دیکھتے ہیں بستی — جہاں انھیں پہنچنا ہے اس کی مسجد کے مینار صاف نظر آتے ہیں مگر اس تک پہنچنے کے لیے پل ہے نہ کشتی — وہ پریشان ہو کر دریا کی طرف دیکھتے ہیں دریا ہر جگہ سے ایک جیسا گہرا اور چوڑا ہے بڑا کچھ دیر تامل کرتا ہے، پھر کہتا ہے "اللہ کا نام لے کر چل پڑتے ہیں پتر۔"

"جیسے تمھاری مرضی ابا۔"

"اگر ڈوب گئے تو؟"

"تو آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔"

"تو کافی ہوشیار ہو گیا ہے جمورے" بڑا ہنستے ہوئے کہتا ہے۔

"تمھارا بیٹا جو ہوا ابا۔"

"ضرور ٹھل پڑتے پتر" بڑا کچھ دیر سوچنے کے بعد کہتا ہے "مگر مجھے رات والا خواب یاد آرہا ہے۔"

"کیسا خواب ابا؟"

"بہت ڈراؤنا خواب تھا پتر۔"

"کیا دیکھا تھا ابا؟"

"میں نے دیکھا جمورے کہ بہت بڑا مجمع ہے۔ میں تماشائیوں کے درمیان کوڈیوں والے کو گلے میں ڈالے کھڑا ہوں۔ بچے تالیاں بجاتے اور بڑے زمین پر بچھی چادر پر سکے پھینک رہے ہیں کہ اچانک کوڈیوں والا جسے میں نے تمھاری طرح لاڈ پیار سے پالا ہے میری گردن میں دانت گاڑ دیتا اور اپنا زہر انڈیل دیتا ہے۔"

"پھر کیا ہوا ابا؟"

"پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے لوگوں کے چہرے دھندلا جاتے اور آوازیں ڈوب جاتی ہیں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں موت ایسی نیند کے اندھے کنوئیں میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جارہا ہوں۔ ڈوبتے ڈوبتے رہی سہی طاقت جمع کر کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں آواز کا تیر پھینکتا اور تمھیں پکارتا ہوں۔"

"پھر؟"

"پھر میں اپنی ہی چیخ کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کیا دیکھتا ہوں کہ

آدھی رات کا وقت ہے چاند ڈوب چکا ہے کتے رو رہے ہیں اور اوس سے بوجھل ہوا اداس اداس سی پھر رہی ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر میں نے دیکھا کہ تم ٹھنڈ کی وجہ سے سمٹے ہوئے ہو میں نے تمہارے اوپر چادر ڈال دی جیسے اکھاڑے میں تمہارے گلے پر چھری چلانے اور تمہیں دوبارہ زندہ کرنے کے لیے ڈالا کرتا ہوں مگر رات کے اس اُداس پہر میں مجھے اپنا چادر ڈالنے کا یہ انداز بہت ہی نحس معلوم ہوا اور نیند اڑ گئی۔"

"بس،" چھوٹا کہتا ہے" اس سے تم نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ ہمیں دریا میں نہیں اترنا چاہیے۔"

"ہاں پتر آج کا دن ہمارے لیے اچھا نہیں ہے۔"

وہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا اور سستانے لگتا ہے چھوٹا ابھی تک تازہ دم ہے دوڑ دوڑ کر ٹیلوں پر چڑھتا اترتا ہے اور اچانک پکارتا ہے۔

"ابا پُل —— مجھے پُل دکھائی دے رہا ہے زیادہ دور نہیں ہے۔"

پُل کا نام سن کر بڑے کے بوڑھے جسم میں زندگی کی تازہ لہر دوڑ جاتی ہے وہ اٹھ کر بھاگتا ہوا ٹیلے پر آتا ہے اور اس طرف کو دیکھتا ہے جدھر پانی بہتا ہے پھر خوش ہو کر کہتا ہے" ہاں پُل زیادہ دور نہیں —— مگر راستہ دشوار گزار ہے۔"

"کوئی بات نہیں ابا۔"

دونوں اپنا اپنا سامان اٹھا لیتے اور دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ راستہ مشکل ہے۔ بہت سے نشیب و فراز ٹیلے اور کھائیاں، ندی نالے، گھنا جنگل، خاردار جھاڑیاں اور پاؤں لہو لہان کر دینے والی دوب —— مگر وہ چلتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ دوسرے کنارے پر بستی کی مسجد کے اونچے مینار بھی چلتے رہتے ہیں۔ چلتے چلتے وہ تھک جاتے ہیں۔ صبح سے

دو پہر ہو جاتی ہے مگر پُل اب بھی اتنا ہی دور نظر آتا ہے جتنا اس وقت نظر آتا تھا جب وہ چلے تھے۔ بڑا کہتا ہے۔

"عجیب بات ہے جمورے —— پُل آگے ہی آگے چلتا جاتا ہے۔"

"اور بستی بھی ابا" چھوٹا کہتا ہے "مینار ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔"

"عجیب بات ہے جمورے۔"

"بہت ہی عجیب ابا۔"

"یہ کوئی اسرار ہے پتر۔"

"میرا خیال ہے ابا" چھوٹا کہتا ہے "ہم ہر روز لوگوں سے مخول کرتے ہیں آج ہمارے ساتھ مخول ہو رہا ہے۔"

چلتے چلتے دو پہر ڈھلنے لگتی ہے۔ وہ تھک کر نڈھال ہو جاتے ہیں دریا کا گدلا پانی پی پی کر ان کے ہونٹوں پر پیپڑیاں جم جاتی ہیں خاردار جھاڑیوں سے الجھ الجھ کر لباس تار تار ہو جاتا اور پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں مگر پُل اور بستی کے مینار اب بھی اتنے ہی فاصلے پر نظر آتے ہیں۔

"رک جا پتر" بڑا کہتا ہے "اس پار والی بستی تک پہنچنا شاید ہمارے مقدر میں نہیں ہے ہم اس آگے ہی آگے چلتے ہوئے پُل تک کبھی نہ پہنچ پائیں گے۔"

"پھر کیا کریں ابا؟"

"واپس چلتے ہیں پتر۔"

"نہیں ابا۔ واپس جا کر کیا کریں گے —— ہماری منزل تو اس پار کی بستی ہے اور پھر ابا —— واپس پلٹ جانا مردوں کا کام نہیں ہے۔"

"ہاں پتر تم ٹھیک کہتے ہو —— ہماری تو نانیاں بھی دریا کی بپھری ہوئی لہروں سے نہیں ڈرتیں —— کچے گھڑوں پر ٹھل پڑتی ہیں۔"

"واہ ابّا ـــ کیا بات کہی ہے ـــ چلو ٹھل پڑتے ہیں۔"
"نہیں پتّر ـــ تم تھک جاؤ گے ـــ اور پھر ہمارے پاس سامان ہے۔"
"تم میری فکر نہ کرو ابّا ـــ اور سامان کا کیا ہے وہاں جا کر نیا بنا لیں گے"
بڑا کوئی جواب نہیں دیتا۔ سامان نیچے رکھ کر دریا کی طرف دیکھتا رہتا ہے
پھر گانے لگتا ہے "نیں دی ڈوہنگھی تلہ پرانا شینہاں تاں پتّن ملّے۔"
چھوٹا لقمہ دیتا ہے "بیں دی جاناں جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلّے۔"
اچانک کتّوں کے بھونکنے اور مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازیں سنائی
دیتی ہیں۔
"یہ آوازیں؟" چھوٹا کہتا ہے "اس جنگل بیابان میں؟"
"میرا خیال ہے یہاں قریب ہی کوئی آبادی ہے کوئی دوسری بستی۔"
"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"
"پتر کیوں نہ آج کی رات یہیں اس بستی میں گزار لیں صبح سویرے تازہ دم
ہو کر چلیں گے۔"
"جیسے تمہاری مرضی ابا۔"
بڑا کچھ دیر سوچتا رہتا ہے پھر آوازوں کے تعاقب میں چلنے لگتا ہے چھوٹا
پلٹ پلٹ کر دریا کے اس پار والی بستی کی طرف دیکھتا اس کے پیچھے پیچھے چلنے
لگتا ہے۔ دریا کا کنارا لحظہ لحظہ دور ہوتا جاتا ہے اور وہ چھوٹی سی ایک بستی
کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔
اچانک بڑا ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بیری کے درخت کی طرف دیکھ کر
کہتا ہے "یہ کیا تماشا ہے جمورے۔"
جمورا بیری کی طرف دیکھتا ہے۔ زمین سے مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر مارتا ہے
پھر زمین سے بیر اٹھا کر چکھتا اور تھوک دیتا ہے۔
"ہاں ابا ـــ دھر کونے ہی ہیں کڑوے زہر۔"

"رب خیر کرے۔ بیری کے ساتھ دھر کونے" بڑا کہتا ہے "کوئی اسرار ہے پتّر۔"

چھوٹا کوئی جواب نہیں دیتا۔ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتا رہتا ہے۔ بڑا کہتا ہے

"ابابیلیں ہیں پتّر۔"

"ہاں ابّا —— پورا لشکر ہے۔"

"دانہ دُنکا ڈھونڈھ رہی ہوں گی پتّر۔"

"کیا پتہ کچھ اور ڈھونڈھ رہی ہوں ابّا۔"

"اور کیا پتّر؟"

"ہاتھیوں کو ابّا۔"

"نہیں پتّر —— یہ وہ ابابیلیں نہیں ہیں۔ یہ تو ہاتھیوں پر بیٹھ کر چہچہانے اور جوگ بدلنے والی ابابیلیں ہیں۔"

"یہاں سے نکل چلیں ابّا —— یہ ٹھیک جگہ نہیں ہے۔"

"رب خیر کرے گا پتّر" —— بڑا کہتا ہے "کچھ دھندا کر لیں۔ رات بسر کر کے صبح سویرے نکل چلیں گے۔"

"جیسے تمھاری مرضی ابّا۔"

بستی میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کھلی جگہ پر سامان رکھ کر آس پاس کا جائزہ لیتے ہیں۔ پھر چھوٹا زمین پر چادر بچھا کر اس کے ایک کونے پر بیٹھ جاتا ہے اور بڑا بانسری اور ڈگڈگی نکال کر بجانے لگتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے بچّے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں دونوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں بڑا چھوٹے کی طرف دیکھ کر سر ہلاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ —— اب رات بسر کرنے کا اچھا بندوبست ہو جائے گا۔

بڑا بانسری اور ڈگڈگی بجاتا رہتا ہے جب تھک جاتا ہے تو کہتا ہے۔

"پتّر جمورے ــــ یہ بستی بھی عجیب ہے۔ ڈگڈگی بجاتے بجاتے میرا بازو شل ہوگیا ہے اور بانسری میں پھونکیں مارتے مارتے میرا اندر سکھناں ہوگیا ہے مگر ابھی تک کسی بالغ مرد عورت نے جس کے کھیسے میں پیسہ دھیلا ہو ادھر کا رُخ نہیں کیا۔"

"کیا پتہ ابّا" چھوٹا کہتا ہے "یہاں کے مرد عورتیں بہرے ہوں یا انھوں نے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہو۔"

"وہ کیوں پتّر۔"

"وہ اس لیے ابّا ــــ کہ جب بندہ کبھی بھی خیر کی خبر نہ سنے تو آہستہ آہستہ اس کا دل اُکّا سنتے ہی سے اُچاٹ ہوجاتا ہے۔"

"واہ جمورے تو نے سبق خوب پکایا ہوا ہے اچھا یہ بتا تجھے پتہ چلا کہ ان لوگوں نے کبھی خیر کی خبر نہیں سنی۔"

"میں نے ان نیانوں کی صورتوں سے اندازہ لگایا ہے ابّا۔"

"تو بہت ہوشیار ہوگیا ہے جمورے۔"

"تمھارا چیلا جو ہوا ابّا۔"

"واقعی پتّر ــــ ایسا لگتا ہے جیسے یہ سارے یتیم ہیں۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے اپنے باپوں کو خود شہر بدر کر دیا ہوا ہے۔"

"شاید ہم غلط جگہ پر آگئے ہیں!"

"ہاں ابّا۔"

"دیکھنا پتّر ــــ ساری بستی میں کوئی ایک بھی بالغ مرد عورت نہیں ایسا لگتا ہے جیسے وہ سب بھی ہماری طرح دوسری بستیوں میں تماشا دکھانے گئے ہوئے ہوں۔"

"پھر تو ان کی واپسی کا انتظار ضرور کرنا چاہیے ابّا۔"

"کیوں پُتّر؟"

"یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ بڑے مداری ہیں یا تم؟"

"نہیں جمورے مجھے ان بچّوں سے خوف آنے لگا ہے عجیب سے بچّے ہیں۔"

"تو پھر یہاں سے بھی چلتے ہیں ابّا۔"

"ہاں پتّر —— چلے جانا ہی اچھا ہے مگر تو ذرا ان چھوٹوں سے یہ تو پوچھ ان کے بڑے کہاں ہیں۔"

"ہم خود بڑے ہیں" مجمع میں سے ایک بچّے کی آواز آتی ہے "کیا ہم تمھیں چھوٹے نظر آتے ہیں۔"

بڑا اور چھوٹا چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور ابھی اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں کہ چھوٹی عمر کا ایک اور بچّہ نہایت پختہ لہجے میں کہتا ہے۔

"منشی ٹھیک کہتا ہے —— تم لوگ جلدی جلدی کھیل دکھاؤ اور اپنی راہ لو —— ہم ایسے لوگوں کو جو خود کو ہم سے بڑا سمجھتے ہوں بستی میں زیادہ دیر رکنے کی اجازت نہیں دیتے۔"

"تو کیا اس بستی میں پورے قد کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔"

"ہم رہنے ہی نہیں دیتے" —— ایک بچّہ ہنس کر کہتا ہے "ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔"

"تو یہ بستی؟" بڑا ہکلا جاتا ہے۔

"ہاں یہ بستی —— یہ ہماری بستی ہے اور مَیں یہاں کا سردار ہوں۔ لیکن تم وقت ضائع نہ کرو اگر تم نے کوئی اچھا کرتب دکھایا تو ہم تمھیں ضرور انعام دیں گے —— چلو تماشا دکھاؤ۔"

"ابھی تو ہم خود دیکھ رہے ہیں" چھوٹا کہتا ہے۔

"تمیز سے بات کرو لڑکے" سردار غصے سے کہتا ہے "ورنہ!"

"ارے" چھوٹا ہنستا ہے "تم واقعی سردار کے بیٹے لگتے ہو۔"

"سردار کا بیٹا نہیں — میں خود سردار ہوں۔"

"ہاں ہاں — یہ سردار ہے۔" بہت سی آوازیں آتی ہیں۔ چھوٹا ہنستا چلا جاتا ہے پھر بڑے کے قریب آکر کہتا ہے

"میرا خیال ہے ہم بونوں کی بستی میں آگئے ہیں۔"

"مداری — یہ کیا بکواس ہے۔" سردار چلا کر کہتا ہے "یہ ہمیں بونے کہتا ہے اس بدتمیز بچے کو چپ کراؤ ورنہ بستی سے نکل جاؤ۔"

بڑا ششدر کھڑا چاروں طرف دیکھتا ہے پھر کہتا ہے۔

"جمورے چپ ہو جا — یہ کوئی اسرار ہے۔"

"کیا اسرار ہے ابّا — یہ بچے۔"

"یہ بچے نہیں ہیں پُتّر۔" بڑا اس کی بات کاٹ کر کہتا ہے۔

"پھر کیا ہیں ابا؟"

"غور سے دیکھ جمورے — ان کے بال سفید ہیں اور ان کے چہروں پر جھرّیاں ہیں ان کی عمریں زیادہ ہوگئی ہیں مگر ان کے ذہن نابالغ رہ گئے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک ہوسکتے ہیں۔"

"عجیب بات ہے۔"

"بہت ہی عجیب پتّر — رب خیر کرے۔"

اچانک چند بچے بہت سی چارپائیاں اور مونڈھے اٹھائے آتے ہیں اور سردار بچے سمیت بہت سے دوسرے تماشائی بچے بھی ان چارپائیوں اور مونڈھوں پر بیٹھ جاتے ہیں سردار تحکمانہ لہجے میں کہتا ہے۔

"کھیل شروع کیا جائے۔"

بڑا پریشان ہو کر تماشائیوں پر ایک نظر ڈالتا ہے پھر تھیلے میں سے چیزیں نکالنے لگ جاتا ہے۔

سب سے پہلے تو وہ تین گولے نکال کر زمین پر رکھتا ہے پھر انھیں تین پیالوں سے ڈھانپ دیتا ہے کچھ پڑھ کر پھونک مارتا اور باری باری سارے پیالے اٹھا کر دکھاتا ہے گولے غائب ہو چکے ہیں۔

وہ تماشائیوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا ہے مگر وہ تالیاں نہیں بجاتے داد نہیں دیتے چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں۔

پھر وہ پیالوں کو اوندھا کر کے باری باری اوپر اٹھاتا ہے اب ہر پیالے کے نیچے ایک ایک گولہ دکھائی دیتا ہے وہ دوبارہ سردار اور دوسرے تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہے مگر وہ اب بھی خاموش رہتے ہیں۔

پھر وہ جیب سے ایک روپے کا سکّہ نکالتا ہے ایک کے دو اور دو کے چار بناتا ہے اور کہتا ہے۔

" مہربان —— قدردان —— میں جادوگر نہیں ہوں۔ یہ محض ہاتھ کی صفائی ہے جادوگر ہوتا تو یہاں نہ ہوتا گھر میں بیٹھا سکّے بنا رہا ہوتا"

" ہمیں معلوم ہے تم کھیل دکھاؤ" سردار اسے ٹوکتا ہے۔

" تو پھر تم خود ہی میدان میں آجاؤ۔" جمورا کہتا ہے۔

" مداری —— یہ لڑکا" سردار غضبناک ہو جاتا ہے۔

" میں معافی چاہتا ہوں سردار" بڑا کہتا ہے اور اشارے سے جمورے کو خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہے اور باری باری بہت سے کھیل دکھاتا ہے۔ خالی گلاس پانی سے بھر جاتا ہے اور بھرا ہوا گلاس اوندھا کرنے سے پانی نہیں گرتا۔ مٹھی میں بند کر کے نکالنے سے رومال کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ جلتا ہوا سگریٹ نگل کر کانوں کی طرف دھواں نکالتا ہے۔ کوڈیوں والے سے ڈسواتا اور اسے گردن میں ڈال لیتا ہے۔ منہ کے راستے پیٹ میں خنجر اتار کر نکال لیتا ہے۔

مگر سردار سمیت کوئی تماشائی تالی نہیں بجاتا داد نہیں دیتا وہ پریشان ہو جاتا

ہے پھر اعلان کرتا ہے۔
"اب آخر میں مَیں جمورے کے گلے پر چُھری چلاؤں گا اور اسے ذبح کر کے دوبارہ زندہ کر دکھاؤں گا۔"
سردار سمیت سارے تماشائی زور زور سے تالیاں پیٹتے ہیں وہ بے حد حیران ہوتا ہے عام طور پر تماشے کے آخر میں وہ اس کھیل کا اعلان) کیا کرتا ہے تو بہت سے تماشائی اس کھیل کو ناپسند کرتے اور اسے منع کر دیتے ہیں مگر پتہ نہیں یہ کیسے سفّاک تماشائی ہیں کہ چھری چلانے کی بات سن کر تالیاں پیٹنے لگے ہیں۔
وہ جمورے کو زمین پر لٹاتا ہے اس کے اوپر اسی طرح چادر ڈالتا ہے جیسے ہمیشہ ڈالا کرتا ہے پھر تھیلے میں سے چھری نکال کر اس کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے۔
"صاحبان —— قدردان —— کوئی باپ اپنے بیٹے کی گردن پر چُھری نہیں چلا سکتا —— نہ ہی اللہ کے پیغمبروں کے سوا کسی میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہو سکتا ہے —— یہ سب کچھ ایک کھیل ہے —— نظر کا دھوکہ —— اس پاپی پیٹ کی خاطر۔"
"باتوں میں وقت ضائع نہ کرو" سردار کہتا ہے۔
"چھری چلاؤ" —— ایک طرف سے آواز آتی ہے۔
"چھری چلاؤ —— چھری چلاؤ" تماشائی شور مچاتے ہیں۔
وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور جمورے کے قریب آ کر چھری چلاتا ہے۔
تماشائی زور زور سے تالیاں اور سیٹیاں بجاتے، سکّے پھینکتے اور بکرے بلاتے ہیں اور جمورے کے دوبارہ زندہ ہونے کا کھیل دیکھے بغیر کھسکنے لگتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے سارا پڑ خالی ہو جاتا ہے۔
وہ جمورے کو آواز دیتا ہے" اٹھ پتّر —— پیسے جمع کر"
مگر جمورا کوئی جواب نہیں دیتا۔
وہ گھبرا کر چادر ہٹاتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ جمورا خون میں لت پت ہے
اس کی گردن سچ مچ کٹی پڑی ہے۔
اس کی چیخیں ساری بستی میں گونجنے لگتی ہیں۔

شب چراغ

خوشبو اور بدبو کے معاملے میں وہ بہت حساس تھا اور جس طرح شاعر غنچے کی چٹک سن سکتا۔ مصور آواز کا رنگ دیکھ سکتا اور مغنی سُر سے ہمکلام ہو سکتا ہے بالکل ایسے ہی وہ خوشبو کو پڑھ سکتا تھا اور محسوس کر سکتا تھا۔

خوشبو خواہ کیسی ہی مدھم اور کتنے ہی فاصلے پر ہوتی وہ ہوا کے کسی نہ کسی جھونکے سے اسے اچک لیتا۔

اسے بہت سی اور طرح طرح کی خوشبوؤں کی پہچان کا دعویٰ تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اسے مٹی اور پتھر سے بھی خوشبو آتی تھی اور وہ چیزوں کو دیکھ اور سن کر بھی ان کی خوشبو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے دوست مذاق میں اسے نجس چوپائے سے تشبیہ دیتے مگر وہ اس کا بُرا نہ مناتا، کہتا۔

"تمھاری زکام زدہ ناکیں ان گنت خوشبوؤں سے محروم ہیں جو میں سونگھتا رہتا ہوں یا سونگھ سکتا ہوں۔"

مگر اب یہی خوبی جس پر وہ کبھی اترایا کرتا تھا اس کے لیے وبالِ جان بن گئی تھی۔ پتہ نہیں وقت کے ساتھ ساتھ اس کے سونگھنے کی حس میں نقص پیدا ہو گیا تھا یا خوشبوؤں اور بدبوؤں کی نوعیت تبدیل ہو گئی تھی۔ اسے کچھ عرصہ سے اپنے قریب کہیں بدبو کا احساس ہوتا۔ وقفوں کے ساتھ بساندسی آتی۔ اس نے اس

بدبو کا سراغ لگانے اور اس کی نوعیت جاننے کی بہت کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی اور جیسے ہنستے کھیلتے، گپ لگاتے درمیان میں کبھی کبھی اداس کر دینے والا کوئی خیال آجاتا ہے یا جیسے ناول پڑھتے یا فلم دیکھتے ہوئے کبھی کبھی کوئی تلخ یاد آجاتی ہے بالکل اسی طرح دفتر میں کام کرتے، ڈکٹیشن دیتے، ٹیلی فون سنتے اور ملاقاتیوں سے رسمی گفتگو کرتے کرتے درمیان میں اچانک لمحہ بھر کے لیے ایک ناگوار سی بدبو کا احساس ہوتا۔ یوں لگتا جیسے کہیں آس پاس کوئی چیز مر گئی ہے اور گل سڑ رہی ہے۔

اس کے کہنے پر دفتر میں ہر روز صفائی کی جانے اور دوائی چھڑکی جانے لگی مگر بدبو کے احساس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ تنگ آکر ایک دن اس نے اپنے عملے کی مدد سے الماریوں، شیلفوں اور میز کی درازوں میں رکھے کاغذات اور فائلوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا مگر کوئی زندہ یا مردہ چیز کہیں سے برآمد نہ ہوئی پھر بھی اسے یقین تھا کہ کہیں قریب ہی کوئی چیز گل سڑ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسی بدبو تھی اور اس سے کیسے نجات پائی جا سکتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے دفتر کے عملے کو کسی قسم کی بدبو کہیں سے نہ آتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ یہ اس کا وہم ہے۔

اسے یقین ہو چلا تھا کہ یا تو وہ خوشبو اور بدبو میں تمیز کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا یا پھر کوئی چیز اس کے اپنے اندر مر گئی تھی۔ بچپن میں ایک بار اس کا زکام بگڑ گیا تھا اور کئی روز تک اسے ہر چیز سے بدبو آتی رہی تھی کیا پتہ اس بار لگنے سے پہلے ہی اس کا زکام بگڑ گیا ہو مگر پھر اسے خیال آتا کہ اگر ایسا ہوتا تو اسے ہر وقت ہر چیز سے بدبو آتی۔

ایک روز اس نے سوچا کہ کسی تجربہ کار ڈاکٹر یا ماہر نفسیات سے رجوع کرے کیا پتہ سچ مچ اس کے سونگھنے کے اعصاب میں کوئی خلل واقع ہو گیا ہو لیکن جس روز اس نے اپنا معائنہ کرانے کا سوچا اسی روز کیئر ٹیکر نے اطلاع دی،

"سر آپ ٹھیک کہتے تھے۔ فالس سیلنگ سے مری ہوئی چوہیا بر آمد ہوئی ہے .... ہم اس کے لیے معافی چاہتے ہیں۔"

مری ہوئی چوہیا کے بارے میں سن کر وہ بہت خوش ہوا اور اس کا یہ شک کہ اس کی قوتِ شامہ میں کوئی نقص واقع ہو گیا تھا یا اس کے اندر کوئی چیز مر گئی تھی، دور ہو گیا اور وہ اطمینان سے DFA پڑھنے میں مصروف ہو گیا مگر جب چھٹی سے تھوڑی دیر پہلے وہ اوپر سے آئی ہوئی ایک فائل کو نیچے بھیجنے کے لیے دستخط کر رہا تھا تو وہی بساندسی پھر آئی اور لمحہ بھر کے لیے اسے پریشان اور بد مزہ کر کے غائب ہو گئی۔ اس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور کہا۔

"کیئر ٹیکر صاحب سے کہو سیلنگ پینلز اکھاڑ کر دوبارہ چیک کریں یقیناً ایک آدھ چوہیا اور بر آمد ہو گی۔"

انھوں نے ایسا ہی کیا مگر کوشش کے باوجود کوئی زندہ یا مردہ چوہیا کہیں سے بر آمد نہ ہو سکی پھر بھی اسے یقین تھا کہ انھوں نے سہل پسندی سے کام لیا ہو گا ورنہ کچھ نہ کچھ مرا ہوا کہیں نہ کہیں ضرور موجود تھا اور گل سڑ رہا تھا۔

دوپہر کو اسے باس نے اپنے کمرے میں بلایا وہ حاضر ہوا تو انھوں نے خلافِ معمول نہایت خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا اس کی خیریت دریافت کی اور اس کے لیے کافی منگوائی۔ کمرے میں میز پر سجے پھولوں کی بھینی بھینی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا لیکن جب وہ کافی پیتے ہوئے ہدایات لے رہا تھا تو اچانک سڑاند کا ایک جھونکا آیا اور اسے پریشان کر گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر ہوا میں سونگھا اور باس سے پوچھا۔

"سر آپ کو بھی بدبو محسوس ہوئی؟"

"کیسی بدبو؟"

"جیسے کوئی چیز مری ہوئی ہو۔ چوہیا، چھپکلی یا سم تھنگ لائک دیٹ؟"

انھوں نے ریوالونگ چیئر پر گھوم کر اپنے اِرد گرد کی ہوا سونگھی اور بولے۔

"آئی ڈونٹ فائینڈ اینی تھنگ رانگ۔"
پھر کچھ سوچ کر خود ہی کہنے لگے۔
"یس یو آر رائٹ ..... میری پنڈلی پر پھوڑا نکلا ہوا ہے شب چراغ۔"
"شب چراغ؟"
"ہاں شب چراغ یعنی کاربنکل۔ ڈاکٹر سے مایوس ہو کر اب میں ایک حکیم صاحب سے علاج کرا رہا ہوں۔ انھوں نے مرہم دیا ہے اسی کی بُو ہوگی۔"
"یہ کوئی خطرناک تو نہیں؟"
"ہے تو سہی۔ نام تو اس کا سرخ یاقوت کی مماثلت سے بڑا خوب صورت ہے مگر بڑی تکلیف دہ چیز ہے۔"
میں معافی چاہتا ہوں سر۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا وہ دوسری قسم کی کوئی بُو تھی۔
"کوئی بات نہیں۔"
"وہ ہدایات لے کر چلا گیا لیکن اسے شک تھا کہ ضرور اسی پھوڑے کی بساند ان کے دفتر میں پھیلی ہوئی تھی یا پھر باس کے کمرے میں بھی کہیں کوئی چوہیا مری پڑی تھی۔ لیکن اگلے روز اسے وہی سڑاند کانفرنس روم سے بھی آئی ..... اور اس نے کیئر ٹیکر کو سیلنگ اکھاڑنے کی ہدایت کی۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ اسے دفتر کے ہر کمرے سے وہی بساند آنے لگی۔ مرے ہوئے گلے سڑے چوہے کی۔ اسے بُرے بُرے خیال آتے۔ کہیں شہر میں طاعون پھوٹنے والا نہ ہو۔ کہیں اس کے اِرد گِرد لوگوں میں ہر ایک کو کاربنکل نہ نکل آیا ہو۔ اور اس کا جی ہر وقت متلانے لگا اور اسے اُبکائیاں سی آتی رہتیں کئی بار وہ اٹھ کر قے کرنے کے لیے باتھ روم بھی گیا مگر ہر بار اسے صرف اُبکائیاں آتی رہیں اور تھوک سے منہ لتھڑ لتھڑ جاتا۔
آخر اس نے دفتر سے چند روز کی چھٹی لے لی۔ شاید کچھ روز آرام کرنے

اور لوگوں سے الگ رہنے سے اس کا وہم دور ہو جائے اور بد بو کا احساس کم ہو جائے لیکن اگلی صبح جب وہ دیر سے سو کر اٹھا اور اخبار پڑھنے لگا تو اسے کہیں قریب ہی سے وہی بد بو پھر آئی جیسے چربیلا گوشت جل رہا ہو جیسے شب چراغ!

اس نے بیوی کو آواز دی وہ آئی تو اس نے پوچھا

"یہ بد بو کیسی ہے؟"

"کونسی بد بو؟"

"تمھیں محسوس نہیں ہوتی؟"

"نہیں مجھے زکام ہے۔"

"یوں لگتا ہے جیسے کوئی چیز سڑ رہی ہو دفتر میں بھی ایسا ہی تھا۔"

"میں سمجھ گئی" وہ بولی "وہ میں آملیٹ بنا رہی تھی ذرا جل گیا ہے۔"

"شاید اسی کی ہو" اس نے بے یقینی سے کہا "ذرا احتیاط کرو میں پہلے ہی اس سڑاند کے احساس سے عاجز آچکا ہوں۔"

اخبار سامنے رکھ کر وہ ناشتہ کرنے لگا تو اسے کہیں سے پھر وہی بد بو آئی اس نے کہا

"اب تو تم آملیٹ نہیں بنا رہی ہو۔ اب یہ کیسی بدبُو ہے۔"

اس کی بیوی نے ہوا میں دو ایک بار سونگھا پھر بولی

"مجھے تو زکام ہے۔"

"کہیں گٹر کا ڈھکنا تو کھلا نہیں رہ گیا؟"

"ڈھکنا کھلا ہوتا" وہ ہنس کر بولی "تو آپ یہاں بیٹھ کر ناشتہ کر سکتے تھے؟ ہاں ہمارا فلش کل سے ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ ٹھہریں میں فینائل چھڑک کر آتی ہوں۔"

وہ چلی گئی تو اس نے ریڈیو کا سوئچ آن کیا اور خبریں سننے لگا اور حالاں کہ

اس کی بیوی اب تک فینائل چھڑک چکی تھی مگر اسے بدبُو کے بہت سے جھونکوں نے آن گھیرا۔ اس نے تقریباً چلاّ کر کہا " اب میں گھر سے بھاگ کر کہاں جاؤں؟"

" آپ اس معاملے میں بہت حساس ہیں کمروں کی سیلن وغیرہ ہے اور کچھ نہیں۔ آپ لان میں کیوں نہیں بیٹھ جاتے ؟"

" ہاں یہ ٹھیک ہے" اس نے جواب دیا اور اخبار لے کر لان میں آگیا۔

جب وہ کرسی پر نیم دراز ہو کر اخبار پڑھ رہا تھا تو اسے پھر وہی سڑاند آئی اس نے اخبار کو سونگھ کر دیکھا اور اسے ہنسی آگئی کہنے لگا۔

" اخبار سے بھی بدبو آرہی ہے اخباری کاغذ اور سیاہی کی" اس کی بیوی نے اس کی بات نہیں سنی تھی باہر آتے ہوئے بولی۔

" آپ کے سونگھنے کی حِس واقعی بہت تیز ہے آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں بڑی پیٹی کے نیچے کم بخت چھپکلی مری پڑی تھی۔"

اس کی بیوی نے اس کے کہنے پر گھر کا کونہ کونہ صاف کیا۔ کپڑوں، لحافوں اور قالینوں کو دھوپ میں ڈال کر سکھایا کرسیوں اور صوفوں کو کھٹملوں اور لال بیگوں سے پاک کیا، غسل خانوں اور نالیوں میں دوائی چھڑکی۔ ٹرنکوں میں نئے سرے سے فینائل کی گولیاں رکھیں اور پائپ سے سارے گھر کے فرشوں کو دھو ڈالا۔ مگر سہ پہر کے وقت جب وہ ٹیلی ویژن پر وگرام دیکھ رہا تھا بدبُو کا جھونکا پھر آیا اور اس کا جی متلا کر چلا گیا اس کی بیوی نے کہا۔

" میرا خیال ہے پچھلی گلی والے آج پھر سری پائے اٹھا لائے ہیں اور اب انھیں ساڑ رہے ہیں ؟"

" ہو سکتا ہے" اس نے کہا " بال اور چمڑا جلنے کی مِلی جُلی بُو ہے، چمار کہیں کے۔"

اگلے روز جب وہ سودا سلف خریدنے بازار گیا تو اُسے یہ جان کر تعجب ہوا کہ سگریٹ کے کھوکھے، کریانے اور جوتوں کی دُکانوں حتیٰ کہ بُک سٹال سے بھی

وہی سڑاند اٹھ رہی تھی۔ پتہ نہیں لوگوں کو پھوڑے نکل آئے تھے یا انھوں نے صفائی کا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا یا پھر وہ خود زود حسی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے، پیچھا کرنے والے بدبُو کے جھونکوں سے کیسے نجات حاصل کرے۔

اچانک اسے خیال آیا کیوں نہ وہ اس تقریب میں چلا جائے جس کے بارے میں اس نے صبح اخبار میں خبر پڑھی تھی۔ کیا پتہ اس کا جی وہاں جا کر بہل جائے۔ اس نے جلدی جلدی خریداری مکمل کی، گھر آکر کپڑے تبدیل کیے اور ناک پر رومال رکھے بدبو کے جھونکوں سے بچتا بچاتا تیز تیز قدم اٹھاتا اجلاس میں پہنچا اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔

ہال میں سگریٹ کے خوشبودار دھوئیں، لونڈر اور خوب صورت شعروں اور لفظوں کی ملی جلی باس پھیلی ہوئی تھی اس نے اطمینان کا سانس لیا اور تقریر سننے لگا مگر اس کی خوشی عارضی ثابت ہوئی تقریر سنتے سنتے اس کا جی متلانے لگا اور اسے ابکائیاں آنے لگیں۔

خوشبو اور بدبو کے معاملے میں وہ بہت حساس تھا اور جس طرح شاعر غنچے کی چٹک سن سکتا، مصور آواز کا رنگ دیکھ سکتا اور مغنّی سُر سے ہم کلام ہو سکتا ہے بالکل ایسے ہی وہ خوشبو کو پڑھ سکتا تھا، سن سکتا تھا اور محسوس کر سکتا تھا۔

دامِ شنیدن

(ڈنگر بولی)

انھیں شک ہے کہ میں نے اپنا عقیدہ بدل لیا ہے حالاں کہ ایسا بالکل نہیں ہے میں نے صرف گوشت خوری ترک کی ہے۔

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو گوشت نہیں کھاتے یعنی ویجی ٹیرین ہیں ان کے پاس گوشت نہ کھانے کی اپنی اپنی وجوہات ہوں گی ہو سکتا ہے بعض لوگ کسی عقیدے کی بنا پر گوشت نہ کھاتے ہوں۔ بعض کو ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہو کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کا نفسیاتی مسئلہ ہو گا مثلاً میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جس کا بچپن میں ایک بار زکام بگڑ گیا تھا اور اسے ہر چیز سے مردار کی بُو آتی تھی۔ ایسے میں اسے گوشت کی یخنی پلائی گئی تو اسے قے ہو گئی کیوں کہ اسے اس میں سے مردار کی بُو آئی، حالاں کہ یہ بو اس کے اپنے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ مگر اس کا دل اس روز سے ہمیشہ کے لیے گوشت سے پھر گیا۔ لیکن میرا معاملہ بالکل مختلف ہے میں بچپن سے اب تک گوشت خوری کا شوقین رہا ہوں اور بھنا ہوا گوشت تو میری محبوب ترین غذا رہا ہے اور حالاں کہ خون میں یورک ایسڈ کی مقدار زیادہ ہو جانے کی وجہ سے مجھے کئی بار ڈاکٹروں نے اس سے پرہیز بتایا اور اس کے نتائج سے آگاہ کیا۔ مگر میں ان کی ہدایات پر کبھی پوری طرح

عمل نہ کر سکا۔ مگر اب میں نے کچھ عرصہ سے گوشت خوری بالکل ترک کر دی ہے۔ تاہم اس کی وجہ عقیدے کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ اس کا عقیدے سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ میں عام طور پر اس کا ذکر اس لیے نہیں کرتا کہ شاید کسی کو یقین نہ آئے۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ مجھے اصل بات بتا ہی دینی چاہیئے تاکہ میرے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

مجھے بچپن ہی سے مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق تھا اور میں نے چند ایک زبانیں سیکھیں بھی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرا جانوروں اور وہ بھی بھیڑ بکریوں کی زبان سیکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے بس اتفاق اور میری بد قسمتی ہی سمجھیے کہ میں یہ زبان بلا ارادہ سیکھ گیا۔ ہوا یوں کہ ایک زمانے میں ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ جہاں ہمارا گھر تھا وہاں پچھواڑے میں بھیڑ بکریوں کا ایک باڑہ تھا میں رات کو دیر تک اسکول کا کام کرتا اور جاگتا رہتا اور بھیڑ بکریوں اور ان کے میمنوں کی آوازیں سنتا رہتا۔ دو ایک بار اندھیری رات میں بھیڑیا باڑے میں گھس آیا اور ایک آدھ بھیڑ اٹھا کر لے گیا۔ جس کے بعد بھیڑ بکریاں اور میمنے ہر وقت ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہنے لگے۔ خصوصاً گرمیوں کی تاریک راتوں میں بھیڑیوں کے خوف سے بھیڑ بکریاں رات رات بھر ممیاتی رہتیں۔ میں لیمپ بجھا کر سونے کی کوشش کرتا مگر ان کی آوازیں اور سرگوشیاں مجھے سونے نہیں دیتیں پھر پتہ نہیں کیسے خود بخود ان کی زبان میری سمجھ میں آنے لگ گئی۔ رات بھر میمنے اس قسم کی باتیں کرتے رہتے۔

”ماں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”ماں مجھے بھوک لگی ہے۔“

”ماں دن کب نکلے گا۔“

”ہائے مجھے سردی لگ رہی ہے۔“

اور ہر ماں کی طرح ان کی مائیں بھی انھیں جھوٹی تسلیاں دیتی رہتیں۔

ایک دفعہ ابّا کو پتہ نہیں کیا بیماری لگ گئی۔ حکیم صاحب نے انھیں گولیاں دیں اور ہدایت کی کہ وہ ان کو بکری کے دودھ کے ساتھ ایک عرصہ تک استعمال کریں، کچھ روز تو ابّا پڑوس والوں سے دودھ مانگتے رہے پھر انھوں نے دودھ دینے والی ایک بکری خریدلی۔ جس کے ساتھ دو ننھے منے گل گتھنے میمنے بھی تھے۔ ایک کالا دوسرا ڈب کھڑبا۔ اس طرح مجھے بکروں کے زیادہ قریب رہ کر ان کی زبان سیکھنے کا موقع مل گیا۔ میمنوں سے میری گہری دوستی ہو گئی۔ میں سکول سے واپس آکر دیر تک ان سے کھیلتا رہتا انھیں اپنے قاعدے اور کتابوں سے کہانیاں اور نظمیں پڑھ پڑھ کر سناتا۔ شام کو انھیں اپنے ساتھ کھیتوں کھلیانوں میں لے جاتا ان کے لیے درختوں سے ٹہنیاں کاٹتا وہ درختوں کے پتّے کھاتے رہتے میں پہاڑے یاد کرتا رہتا، پتّے کھاتے، گھاس چرتے اور پہاڑے یاد کرتے ہم آپس میں باتیں بھی کرتے رہتے رات کو وہ اپنی ماں کو دن بھر کی سیر اور کھیل کود کی تفصیل بتاتے اور دوڑنے، چھلانگیں لگانے، کھال اور گڑھے پھلانگنے، بلند ٹیلوں اور جھاڑیوں پر چڑھنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی ڈینگیں مارتے۔

"میں بڑا ہو گیا ہوں" ایک کہتا۔

"نہیں میں اس سے بڑا ہو گیا ہوں" دوسرا کہتا۔

بکری ان کے ہوشیار اور بڑا ہونے کی باتیں سن کر اداس ہو جاتی۔ اور کہتی۔

"کاش تم ہمیشہ چھوٹے ہی رہو۔ کبھی بڑے نہ ہو"

ان دونوں کی سمجھ میں بالکل نہ آتا ماں ایسا کیوں سوچتی اور کہتی تھی۔ وہ برا مناجاتے اور دیر تک اس سے روٹھے رہتے۔ میں نے بھی انھیں بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ان کے بڑے ہونے پر کس قسم کے حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔

پھر ایک دن ڈب کھڑبّا گم ہو گیا۔ ہم نے بہت ڈھونڈا۔ مگر اس کا کچھ

پتہ نہ چلا۔ بکری کئی روز تک اسے یاد کر کے چلاّتی اور ممیاتی رہی ہیں اور کالا بھی اسے یاد کرتے رہے پھر آہستہ آہستہ بھول گئے۔

کالا اب اور بڑا ہو گیا تھا۔ اس کے سینگ بڑے اور نوکیلے ہو گئے تھے اور اس کے جسم سے بڑے بکروں جیسی بو آنے لگی تھی۔ بڑے بوڑھے اکثر اس کا منہ کھول کر اس کے دانت دیکھتے۔ میرے ہم عمر لڑکے اسے دیکھ کر ڈر جاتے حالاں کہ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا تھا۔ میں اسے ساتھ لے کر گھومتا رہتا۔ ہم ایک دوسرے کی زبان ہی نہیں اشارے بھی سمجھتے تھے۔ میں اسے جہاں بلاتا وہ دوڑ کر پہنچ جاتا۔ جس بات سے منع کرتا منع ہو جاتا۔ میں جدھر جاتا وہ میرے پیچھے پیچھے آجاتا مجھے دور سے پہچان لیتا۔ میری خوشبو سے مجھے جان لیتا۔ لیکن ایک روز بڑا دلچسپ واقعہ ہو گیا۔

وہ میرے مغالطے میں شیقو نائی کے پیچھے چل دیا۔ شیقو بے چارہ گھبرا گیا۔ وہ جدھر جاتا جس قدر تیز بھاگتا کالا بھی اس کے پیچھے دوڑتا آتا خوف سے تھر تھر کانپتا شیقو بڑی مشکل سے جان بچا کر گھر پہنچا۔ اس کی ماں شکایت لے کر آئی کہ آپ کے بکرے نے مارنے کے لیے دور تک میرے بیٹے کا پیچھا کیا ہے۔ شیقو کی ماں چلی گئی تو میں نے بکرے سے استفسار کیا اور یہ جان کر میری ہنسی چھوٹ گئی کہ شیقو نے اس روز اسی رنگ کی چادر اوڑھی ہوئی تھی جیسی میری چادر تھی اور کالا یہ سمجھتا رہا کہ وہ میرے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ بکرے نے بھی اس واقعے پر ہنسنا چاہا مگر کوشش کے باوجود نہ ہنس سکا۔ اور دیر تک اس بات پر اداس رہا کہ اسے ہنسنا نہیں آتا تھا۔ لیکن اگلے روز یہ معلوم کر کے کہ اس کی ماں سیم نالے کے پل سے گر کر زخمی ہو گئی تھی اور اسے ذبح کیا جا رہا تھا۔ ہم دونوں سخت پریشان ہو گئے۔ میں اسے دیر تک تسلی دیتا اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن بعد میں جب اسے پتہ چلا کہ میں نے بھی اس کی ماں کا گوشت مزے لے لے کر کھایا ہے تو مجھ سے بدکنے

لگا اور کئی روز تک میرے قریب آنے سے ہچکچاتا رہا۔ میں اسے پیار کرنے لگتا تو وہ سمجھتا میں دانتوں سے اس کی بوٹی نوچنے لگا ہوں۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں آدمی ہوں بھیڑیا نہیں۔ ہم آدمی زندہ جانوروں کو نہیں کھاتے۔ کھانے سے پہلے انھیں مار لیتے ہیں۔ کچا نہیں چبا جاتے۔ چبانے سے پہلے آگ پر بھون لیتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ کچھ دنوں بعد اس کا خوف کم ہو گیا اور وہ مجھ پر پہلے کی طرح اعتماد کرنے لگا۔

میں نے پرائمری کا امتحان پاس کر لیا اور شہر کے ہائی سکول میں داخلہ لے لیا تو وہ بہت اداس ہو گیا مجھے بھی اس سے بچھڑنے کا بہت افسوس تھا۔ مگر مجبوری تھی۔

بڑی عید کی چھٹیوں میں میں خوش خوش گاؤں واپس آیا۔ لیکن یہ جان کر میری ساری خوشی کافور ہو گئی کہ اس بار عید پر اس کی قربانی دی جا رہی ہے۔ میں نے گھر میں ہر ایک کی منت سماجت کی کہ وہ میرے کالے کو چھوڑ دیں اور قربانی کے لیے کوئی دوسرا بکرا یا دنبہ خرید لیں۔ مگر میری ایک نہ چلی کالے کو بالکل پتہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیتنے والی ہے۔ میں نے بھی اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا وہ خوش خوش میرے ساتھ دوڑتا پھرتا۔ چھلانگیں لگاتا۔ اونچے پیڑوں کے تنوں سے چمٹ کر پتے نوچتا اور میری ٹانگوں سے سینگ رگڑ رگڑ کر اظہار محبت کرتا۔ مگر جب اسے لٹا کر چھری چلا رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں میں اسے ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے اپنے کمرے میں چھپ گیا تھا مگر اس کی چیخ پکار مجھے سنائی دے رہی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں آ کر اسے بچالوں گا اس لیے آخری وقت تک مجھے پکارتا اور داد فریاد کرتا رہا مگر میں آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ میرا خیال تھا میں احتجاج کے طور پر کم از کم اس کا گوشت نہیں کھاؤں گا۔ مگر جب گوشت پک کر میرے سامنے آیا تو اس کی خوشبو سونگھ کر میرے منہ میں پانی

بھر آیا اور میں نے سب کچھ بھول کر بوٹیاں کھانا شروع کر دیں۔
اس کے بعد میں نے کبھی کسی بکرے یا پالتو جانور سے دوستی نہیں کی۔ ہر بقرعید پر ہمارے ہاں دنبہ یا بکرا آتا رہا اور ذبح ہوتا رہا لیکن میں کوشش کرتا کہ ان سے دوستی یا محبت نہ ہو۔ ورنہ زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ حالاں کہ ابا کا خیال تھا، جانور سے جتنی زیادہ مانوسیت اور محبت ہو اتنا ہی زیادہ ثواب ملتا ہے۔ لیکن میں کوشش کے باوجود خود میں اتنی ہمت نہ پاتا۔ چناں چہ جب قربانی کا وقت آتا میں عید ملنے کے بہانے کسی رشتہ دار یا دوست کے ہاں چلا جاتا۔ اور اس وقت گھر آتا جب بکرا یا دنبہ کٹ چکا ہوتا۔ ابا کہتے تھے اس سے ایمان کمزور پڑ جاتا ہے۔ لیکن میں ایمان کو کمزور نہیں پڑنے دیتا تھا۔ کٹے ہوئے بکرے یا دنبے کو مزید کاٹنے، بوٹیاں چیرنے اور خویشوں اور درویشوں میں تقسیم کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ گھبراہٹ اور کمزوری کا اظہار میں صرف اسی وقت تک کرتا تھا جب تک بکرا یا دنبہ زندہ ہوتا اور دیکھ، سن بول اور محسوس کر سکتا۔ ہاں مجھے سری سے بہت ڈر لگتا۔ میں قصاب کی دکان پر بھی بکرے یا دنبے کی سری دیکھتا تو اس کی بے جان آنکھوں کا سامنا نہ کر سکتا مجھے ایسا لگتا جیسے وہ مجھ پر گڑی ہوں اور کچھ کہہ رہی ہوں۔ میری یہ کوشش بھی ہوتی کہ میں کسی بکرے کو پتہ نہ چلنے دوں میں اس کی زبان جانتا ہوں۔ میں نے گھر والوں اور جاننے والوں سے بھی اس کا ذکر نہیں کہ میں بکروں کی زبان جانتا ہوں لیکن ان کی زبان جاننے سے خاصی تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی۔ بعض اوقات مجھے لگتا میں اندر سے بکرا بنتا جا رہا ہوں۔
گھر والوں نے کئی بار اصرار کیا کہ عید کی قربانی میں خود کروں اپنے ہاتھ سے بکرے کی گردن پر چھری چلاؤں کیوں کہ ایسا کرنا سنت ہے۔ مولوی صاحب نے بھی مجھے سمجھایا اور بتایا کہ ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی راہ میں خون بہانے کا جذبہ اور جرأت پیدا ہوتی ہے اور آدمی جہاد میں حصہ لینے کی تربیت

پاتا ہے لیکن میں کوشش کے باوجود ایسا نہ کرسکا۔ کیوں کہ ذبح ہونے سے پہلے بکرے جس طرح آہ و بکا کرتے ہیں اسے صرف میں ہی سن اور سمجھ سکتا ہوں اور صرف مجھے ہی اس بات کا اندازہ ہے کہ کسی ہم زبان کو ذبح کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں عام آدمی کسی ہم زبان اور ہم جنس کو قتل تو کرسکتا ہے ذبح نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے پیغمبر کا دل اور حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ انھیں بھی آنکھوں پر پٹی باندھنا پڑتی ہے۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ کاش مجھے بکروں کی زبان نہ آتی ہوتی اور میں اس قدر بزدل نہ ہوتا۔ بہر حال اگرچہ اسے ایمان کی کمزوری پر محمول کیا جاتا تھا مگر میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ سے کسی جانور کو ذبح نہیں کروں گا لیکن پچھلے سال میں اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکا اور یہیں سے خرابی کا آغاز ہوا۔

ہوا یوں کہ بہت سی دعاؤں اور منتوں کے بعد میرے گھر میں اللہ کے فضل و کرم سے بیٹا پیدا ہوگیا۔ بہت خوب صورت اور بالکل میمنے کی طرح پیارا ابا نے فوراً عقیقے کے لیے دو بکرے منگوا لیے؛ شہر میں رہتے رہتے اب بکروں سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی اور گفتگو سے تو میں خود بھی گریز کرتا تھا۔ لیکن عقیقے کے دونوں بکرے کئی روز تک میرے کمرے کی کھڑکی کے قریب صحن میں بندھے رہے خیال تھا کہ جمعرات کو عقیقہ کیا جائے۔ لیکن آپا کو سسرال سے آنے میں دیر ہوگئی۔ شاید ان کا کوئی جیٹھ یا دیور بیمار تھا۔ اس دوران میں دونوں بکرے رات کو جگالی کرتے ہوئے عجیب و غریب گفتگو کرتے رہتے۔ پتہ نہیں انھیں کیسے اپنے انجام کی خبر ہوگئی تھی۔ چھوٹا بہت زیادہ خوف زدہ تھا۔ ایک رات کہنے لگا۔

"ذبح کس طرح کرتے ہیں؟"

"زمین پر لٹا کر چھری چلا دیتے ہیں۔" بڑے نے کہا

"تکلیف تو بہت ہوتی ہوگی؟"

"ہاں میں نے ایک بار دیکھا تھا بڑی دیر تک جان نکلتی رہتی ہے۔"

"ذبح کیوں کرتے ہیں؟"

"کھانے کے لیے ان کے منہ میں بھی بھیڑیئے کے دانت ہوتے ہیں۔"

"میری تو ڈر کے مارے ابھی سے جان نکلنے لگی ہے۔"

"ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے۔"

"کیا دونوں کو ایک ساتھ ذبح کریں گے؟"

"شاید باری باری۔"

"پہلے کون ذبح ہوگا؟"

"تمھیں زیادہ ڈر لگتا ہے اس لیے پہلے میں۔"

"نہیں میں۔"

"نہیں میں۔"

"میں میں میں۔"

مَیں دیر تک ان کی باتیں سنتا رہا پھر اٹھ کر کھڑکی بند کر دی مگر مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔

اگلے روز چھٹی کا دن تھا۔ میں دیر سے سو کر اٹھا۔ دیکھا تو گھر میں دوپہر کے کھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پیاز چھیلے جا رہے تھے۔ مسالہ پیسا جا رہا تھا۔ تکوں، کوفتوں اور بالٹی گوشت کا پروگرام بن رہا تھا۔ والد صاحب شاید قصائی کو بلانے گئے ہوئے تھے۔

کال بیل کی آواز سن کر میں باہر گیا تو پڑوس کی مسجد سے دینی مدرسے کا طالب علم لڑکا کھالوں کے بارے میں پتہ کرنے آیا تھا کہ اتری ہیں یا نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی نہیں اتری ہیں۔

"ابھی تک نہیں اتریں" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ذبح کیے بغیر کیسے اتار سکتے ہیں۔"

"ہاں جی —— یہ تو ٹھیک ہے میں پھر آجاؤں گا۔"
جب ذبح کرنے کا وقت آیا۔ میں گھر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن ابّا نے میرے ہاتھ میں چھری تھما دی اور اصرار کیا کہ میں اپنے ہاتھ سے ذبح کروں۔ میں نے بہت کوشش کی مگر انھوں نے مجھے جانے نہ دیا۔
پہلے چھوٹے کو لایا گیا وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور خوف سے ممیا رہا تھا۔ مجھے بہت ترس آیا۔ میں نے کہا۔
"پہلے بڑے کو لاؤ۔"
بڑے کو لایا گیا تو وہ زور زور سے چیخنے لگا پھر گھگھیائی ہوئی آواز میں چھوٹے سے مخاطب ہوا۔
"منہ دوسری طرف کر لو چھوٹے۔"
چھوٹے کا اپنی جگہ کھڑے کھڑے پیشاب خطا ہو گیا۔
مجھے اس کی رات والی بات یاد آئی۔ میں نے سوچا بڑے کو پہلے ذبح کیا تو وہ ہول سے مر جائے گا۔ چناں چہ میں نے کہا۔
"پہلے چھوٹے ہی کو لاؤ۔"
اصل میں میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ پہلے کسے ذبح کروں۔ وہ چھوٹے کو لے آئے۔ جب اسے لٹایا گیا تو اس نے زور زور سے ممیانا اور چیخنا شروع کر دیا۔
"ہائے میں مرا —— ہائے میں مرا۔"
"حوصلہ کرو۔" میرے منہ سے اچانک نکل گیا "تم اللہ کی راہ میں قربان ہو رہے ہو۔"
بکرے نے چونک کر گردن اٹھائی اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور چھری کے نیچے اپنی گردن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

میں نے اللہ اکبر کہہ کر چھری چلادی اور وہ حلال ہو گیا۔ مگر جب کھانے کا وقت آیا تو مجھے گوشت سے ویسی ہی بُو آئی جیسی اپنے نومولود بیٹے سے آتی تھی۔ اور میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

اس کے بعد میں کوشش کے باوجود کبھی گوشت کو چھو نہ سکا اب انھیں شک ہے کہ میں نے اپنا عقیدہ بدل لیا ہے حالاں کہ ایسا بالکل نہیں ہے میں نے صرف گوشت خوری ترک کی ہے۔

دُنیا کا آخری بھوکا آدمی

ایسا ہوتا ہے۔

ایسا ہو جاتا ہے کہ آپ کے پاس کوئی ضرورت مند آیا اور آپ نے سوچے سمجھے بغیر اپنے دفاع کے لیے اندر کے خسیس اور کمینہ خصلت منشی کو پکارنا شروع کر دیا اور جب منشی اور مہمان رخصت ہوئے آپ کو یاد آنے لگا کہ ضرورت مند شخص سے آپ کے کتنے دیرینہ یا گہرے تعلقات تھے۔ آپ پر اس کے کتنے احسانات تھے یا اس کی ضرورت کتنی جائز اور اہم تھی۔ اب آپ چاہتے ہیں اس کی تلافی ہو جائے مگر نہیں ہو پاتی کہ اس نے کسی اور ذریعے سے اپنی مشکل پر قابو پا لیا ہے اور آپ اب کفِ افسوس ملنے کے لیے رہ گئے ہیں۔

بس کچھ ایسا ہی ہوا۔

ہم ایک پُر تکلف دعوت سے لوٹ رہے تھے، رات کے نو سوا نو بج رہے تھے۔ بازار میں زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ مگر بیکریوں، پان سگریٹ کے کھوکھوں، کھانے پینے کے اسٹالوں اور اوپن ایر ریستورانوں پر ابھی تک رونق تھی۔ مجھے جمائیاں آ رہی تھیں مگر وہ ابھی تک تر و تازہ تھی کیوں کہ اس نے خوب صورت لباس اور قیمتی زیور پہن رکھا تھا۔

گنجائش تو نہیں تھی لیکن آج کل شہر کے اس فیشن ایبل علاقے میں رات

کو کاروں میں بیٹھ کر کھانا پینا کھاتے پیتے لوگوں کا دستور ہے۔ خود کو اس طبقے میں شامل سمجھنے کے لیے ہمیں بھی یہ دستور نبھانا پڑتا ہے۔ میں نے اس کے لیے آئس کریم اور اپنے لیے کولڈ ڈرنک منگایا۔ اب صرف پان کی گنجائش رہ گئی تھی۔ میں منگا بھی سکتا تھا مگر سوچا اسی بہانے ٹہل لوں گا۔ بیٹھے بیٹھے پیٹ میں ہوا بھر گئی تھی۔ میں پان لے کر لوٹا تو وہ تنکوں کی تین ٹوکریاں اٹھائے اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ منع کر رہی تھی اور وہ اصرار —— میں نے کوئی دخل نہ دیا۔ ہوٹل کے لڑکے کو ٹپ دی اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔ وہ بولی۔

"اسے کچھ دے دیں کہہ رہا ہے بھوکا ہوں۔"

"کوئی بھوکا ووکا نہیں ہوتا۔" میں نے ریورس گیئر لگایا۔ "سب مانگنے کے بہانے ہیں۔"

گاڑی ریورس ہوئی۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔

"وہ رو رہا ہے۔"

"کون کہاں رو رہا ہے؟"

میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ ٹوکریاں زمین پر رکھے ننھے بچّوں کی طرح روتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

"بڑے مکّار ہوتے ہیں یہ —— فریبی۔"

میں نے یہ الفاظ نسبتاً بلند آواز مگر کھوکھلے لہجے میں کہے کیوں کہ میں خود کو ڈھارس دینا چاہتا تھا۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ پچپن ساٹھ برس کے ایک بزرگ صورت شخص کو اس طرح بلکتے دیکھ کر میرے اندر بہت کچھ آپ ہی آپ ٹوٹ گیا تھا۔ میں اسے کچھ دے سکتا تھا۔ دینا چاہتا تھا لیکن اب گاڑی سڑک پر آ چکی تھی آگے پیچھے بھاری ٹریفک تھا۔ پھر وہ کیا سوچتی میں اندر سے اتنا کمزور اور زود پشیمان ہوں؟ لیکن گھر پہنچتے پہنچتے مجھے لگا زار و قطار روتا وہ بوڑھا ذہن سے چپک کر میرے ساتھ ہی چلا آیا ہے۔

میں نے کپڑے تبدیل کیے اور ٹیلی ویژن کھولا مگر بند کر دیا۔ کتاب لے کر لیٹا مگر پڑھنے میں جی نہ لگا۔ بار بار بوڑھے کا آنسوؤں سے تر چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا۔ کاش میں نے اسے روپیہ دو روپیہ دے دیا ہوتا۔ یہ الجھن تو نہ ہوتی۔

روپیہ —— جس کا میں نے پان چبا کر تھوک دیا تھا جسے میں سگریٹ کی صورت پھونک رہا تھا۔ جس کی قیمت کا سوڈا واٹر میں بوتل میں چھوڑ آیا تھا اور روپیہ —— جو میں نے ہوٹل کے لڑکے کو ٹپ میں دے دیا تھا۔

کبھی خود پر غصہ آتا کبھی بوڑھے پر —— طرح طرح سے جی کو بہلانے کی کوشش کی کہ ضرور اس کا تعلق پیشہ ور بھکاریوں کے کسی گروہ سے ہوگا اور اب تک اس کی اپنی گاڑی اسے لینے آگئی ہوگی بلکہ اب تک وہ اپنے ڈیرے پر پہنچ کر دن بھر کی کمائی کا حساب لے یا دے رہا ہوگا۔ کیا پتہ وہ اس وقت کسی ریستوران میں بیٹھ کر چکن تکہ یا کڑاہی گوشت کھا رہا ہو یا چرس بھرے سگریٹوں کے کش لگا رہا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے آنسوؤں سے دھلا ہوا اس کا معصوم اور نڈھال چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا اور میں پریشان ہو جاتا۔

پریشانی سے بچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ میں واپس جاؤں اور اگر وہ بھوکا ہے تو اسے کھانے کے لیے کچھ پیسے دے آؤں یا اگر وہ کڑاہی گوشت کھا، یا سگریٹ پھونک رہا ہے تو اس پر نفرین بھیج کر واپس آجاؤں اور مطمئن ہو کر سو جاؤں۔ لیکن میں اپنی ہر کمزوری اس سے چھپاتا رہا۔ اس لیے میں نے کسی ضروری کام کا بہانہ کیا اور گیراج سے گاڑی نکال کر بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔

جونہی میں گلی کا موڑ مڑ کر سڑک پر آیا مجھے دور پہاڑوں میں واقع اس کا چھوٹا سا گھر دکھائی دینے لگا۔ جہاں اس کی بیمار بیوی کھاٹ پر لیٹی کھانس رہی تھی اور زرد رو بیٹی بیٹھی تنکوں کی ٹوکری بنا رہی تھی۔ اس کی بیٹی کو اپنے کام میں بڑی مہارت ہے اور اسے اپنی بنائی ہوئی ٹوکریوں پر بڑا ناز ہے مگر

اسے شکایت ہے کہ قصبے کا دکان دار اچھے دام نہیں دیتا وہ ہر بار بابا سے کہتی ہے کہ وہ ٹوکریاں شہر لے جا کر بیچے اور دیکھے کہ بیگمات ان کی کتنی قدر کرتی ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ بل کھاتی پہاڑی سڑک پر وہ شہر کو جاتی بسوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ٹوکریاں اٹھائے پیدل چل رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شہر میں داخل ہوتے ہی جگہ جگہ بیگمات کاریں روک کر ٹوکریاں دیکھنے کے لیے رک جائیں گی اور ہاتھوں ہاتھ خرید لیں گی۔ پھر وہ بیوی کی دوائی، بیٹی کے کپڑے اور بکری کی گانی خرید کر بس پر سوار ہوگا اور اپنے گھر واپس چلا جائے گا مگر آج تیسرا روز ہے اور اس کی ایک بھی ٹوکری فروخت نہیں ہوئی شاید ان کا فیشن ختم ہو گیا ہے یا ڈیزائن پرانے ہو گئے ہیں وہ سڑکوں اور بازاروں میں ٹوکریاں اٹھائے بھوکا پیاسا مارا مارا پھرتا ہے۔

میں نے بازار کے اس حصے میں جہاں تھوڑی دیر پہلے اسے روتا چھوڑ گیا تھا پہنچ کر گاڑی روکی۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ میرا خیال تھا وہ یہیں کہیں آتی جاتی کاروں کے گرد منڈلاتا ہوگا لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ میری پشیمانی کیسے دور ہوگی۔

میں نے بازار میں گھوم پھر کر اسے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ کہیں نظر آیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ضرور وہ چھپ کر کسی ریستوران میں کھا پی رہا ہوگا۔ اگر میں اسے کھاتے پیتے دیکھ لوں تو مجھے کس قدر سکون ملے۔ دل میں چبھی ہوئی پھانس سی نکل جائے۔

ہوٹلوں اور ریستورانوں میں طرح طرح کے لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ گپ شپ کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں اس کی شکل نہیں تھی لیکن اتنا یاد تھا کہ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی تھی اور وہ پچپن ساٹھ برس کا ایک دیہاتی بوڑھا تھا جس کے پاس تین ٹوکریاں تھیں۔ میں نے ایک ایک ہوٹل میں جا کر اسے تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ لوٹ جاؤں

مگر مجھے اپنی طبیعت کا حال معلوم تھا۔ ذرا سی الجھن بھی ہو تو جب تک اس پر قابو نہ پالوں یا اس کا حل نہ سوچ لوں چین نہیں آتا۔ میں نے اسے فٹ پاتھوں اور ملحقہ پارکوں میں سوئے یا سوتے جاگتے آدمیوں میں بھی تلاش کیا۔ پھر قریبی مسجد وں میں جاکر دیکھا۔ رات کے بارہ بج گئے مگر اس کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ناکام واپس آؤں اور رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہوں۔

تو کیا وہ سچ مچ بھوکا تھا۔ بغیر کچھ کھائے پیے سو گیا۔ سویا کہاں ہوگا۔ خالی پیٹ نیند کہاں آتی ہے۔ بھرے پُرے شہر میں بھوکا رہ کر وہ کیا سوچتا ہوگا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ لذیذ کیک پیسٹریوں سے بھری بیکریوں، خوش ذائقہ مٹھائیوں سے اٹی مٹھائی کی دُکانوں، اناج سے بھرے گوداموں اور خوش رنگ پھلوں سے آراستہ فروٹ شاپس کے سامنے یا کہیں آس پاس آدمی بھوکا پڑا ہو۔

رات بھر عجیب واہیات اور مکروہ خواب دکھائی دیتے رہے۔ کبھی میں دیکھتا، میں جس شخص کی برائیاں بیان کر رہا ہوں وہ عین میرے پیچھے کھڑا سُن رہا ہے۔ کبھی دیکھتا کہ میں نے ایک بچے سے ٹافی چھین کر ہڑپ کر لی ہے اور وہ میرے سامنے زار و قطار رو رہا ہے۔ بار بار آنکھ کھلتی رہی۔ عجیب ندامت بھری رات تھی۔

صبح دفتر جاتے ہوئے میں نے بازار کا ایک لمبا چکر لگایا۔ فٹ پاتھوں، دکانوں کے تھڑوں اور ملحقہ پارکوں پر نظر دوڑائی۔ دفتر میں بھی بار بار مجھے اس کا خیال آتا رہا۔ دفتر سے واپسی پر بھی میں نے بازار کا اس خیال سے چکر لگایا کہ شاید وہ کہیں دکھائی دے جائے اور میں اسے روپیہ دو روپیہ دے کر اس خلش سے نجات حاصل کرسکوں جو مجھے گزشتہ شب سے اندر ہی اندر بے چین کر رہی تھی۔ لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ تاہم مجھے توقع تھی کہ شام کے بعد وہ ضرور اسی جگہ

مل جائے گا جہاں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

میں نے شام ہونے کا بیتابی سے انتظار کیا اور کھانا کھائے بغیر ٹہلنے کے بہانے بازار کی طرف چل دیا۔ میں بڑی دیر تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد گزشتہ رات والی جگہ کا چکّر لگاتا مگر وہ نہ ملا۔ مجھے اس پر غصّہ آنے لگا۔

بد بخت تیری اتنی عمر گزر گئی لیکن تجھے خبر نہ ہوئی کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آخر تو اتنا عرصہ کرتا کیا رہا ہے؟ کہ اس زمانے میں بھی بھوکا سوتا ہے۔ جب اس موضوع پر شاعر نظمیں کہنا اور افسانہ نگار کہانیاں لکھنا ترک کر چکے ہیں۔ تیری زندگی میں کتنے ملک آزاد ہوئے کتنی نئی قومیں اور ملک معرضِ وجود میں آئے۔ کیا کیا ایجادات ہوئیں۔ کتنے علمی اور سائنسی انکشافات ہوئے۔ ٹیکنالوجی نے انقلاب برپا کیا۔ کلرک وزیر سفیر اور سپاہی جرنیل کرنیل بن گئے۔ دینو میراثی کا لڑکا پٹواری بن گیا ـــــ رحمو نائی کا بیٹا کلاس ون افسر لگ گیا۔ وسیم خان راج گیری کرتا تھا اب اے کیٹیگری گورنمنٹ کنٹریکٹر ہے۔ جمیل صاحب پروف ریڈنگ کرتے تھے۔ اب پرنٹنگ پریس کے مالک ہیں ـــــ بسیرا ریڑھی لگاتا تھا اب ہول سیل فروٹ مرچنٹ ہے۔

بد بخت بوڑھے صرف تو رہ گیا ـــــ اتنی تبدیلیاں آئیں اور تجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ ٹھیکے، پرمٹ، لائسنس، نیلام، الاٹمنٹیں، وظیفے ـــــ پتہ نہیں تو کس کھوہ میں چھپا رہ گیا۔ تو نے اپنے پہاڑوں سے اتر کر کبھی دیکھا ہی نہیں ـــــ تو نے دھوپ میں بال سفید کیے۔ ساری دنیا آگے نکل گئی صرف تم پیچھے رہ گئے۔ میرا سکون غارت کرنے کے لیے ـــــ لیکن تم اگر بھوک سے مرتے ہو تو مرو۔ میری بلا سے۔ میری کیا ذمہ داری ہے اور کیا مجھ اکیلے کی ذمہ داری ہے۔

میں نے اسے اگلے روز بھی تلاش کیا۔ یقیناً وہ اپنے

گھر واپس چلا گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں دل کو تسلی دینا چاہتا۔ لیکن ایک بوجھ سا تھا جو میں ہر وقت دل پر لیے پھرتا تھا۔ ایک بے چینی سی تھی۔ ایک خلش تھی جو مجھے بے چین کرتی رہتی تھی۔

پھر ایک روز میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی۔ ایک نامعلوم بوڑھا بس کے نیچے آکر کچلا گیا تھا اور حالاں کہ خبر میں ٹوکریوں کا ذکر نہیں تھا لیکن میں نے یہ یقین کر لینے میں عافیت سمجھی کہ وہ وہی بوڑھا تھا۔ مجھے دکھ ضرور ہوا لیکن اس رات میں چین اور سکون کی نیند سویا جیسے آخری بھوکا آدمی دنیا سے اٹھ گیا ہو۔

غروب ہوتی صبح

عجیب دروغ بھری صبح طلوع ہوئی ہے کہ پتہ ہی نہیں چل رہا وہ جاگ گیا ہے یا ابھی تک سو رہا ہے۔ اگر وہ سو رہا ہے تو سامنے والی کھڑکی اسے کیسے نظر آ رہی ہے اور اگر وہ جاگ رہا ہے تو اسے اپنے خراٹوں کی آواز کیسے سنائی دے رہی ہے۔ ان خراٹوں کے ساتھ ساتھ اسے ان شارکوں کا شور بھی سنائی دے رہا ہے جو اسے نظر تو نہیں آ رہیں مگر خالی کھڑکی کے چھجے پر بیٹھی عجیب و غریب آوازیں نکال کر آپس میں اظہار محبت کر رہی ہیں یا شاید لڑ جھگڑ رہی ہیں۔ اچانک اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ گہرے پانی میں غوطے کھانے لگتا ہے، عجیب کیفیت ہے، وہ سوچتا ہے کہ وہ ڈوب بھی رہا ہے اور خود کو ڈوبتے ہوئے دیکھ بھی رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ ڈوب گیا تب بھی کچھ نہ کچھ بچ جائے گا۔ اسی لمحے آپس میں لڑتی جھگڑتی یا شاید چہلیں کرتی شارکوں میں سے ایک ایسی عجیب و غریب آواز نکالتی ہے جیسے ہنس رہی ہو۔ دوسری آہستہ سے کچھ کہتی ہے۔ پھر پہلی زور سے چلاتی ہے۔

"جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ۔"

اس کے بعد دونوں میں سے کوئی جیسی بھی آواز نکالتی اور کچھ بھی کہتی ہے، دوسری زور زور سے چلانے لگتی ہے "جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ۔"

شاید اب اس کا ذہن کچھ کچھ بیدار ہو گیا ہے کہ خراٹوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی اسے یاد آتا ہے رات وہ دیر تک اپنے پسندیدہ گیتوں کا کیسٹ لگا کر سنتا رہا ہے، پڑوس سے نامانوس آوازوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈ کا بٹن دباتا ہے مگر جوں ہی گیت ختم ہوتا ہے شارک کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ"

اس کے بعد جو بھی گیت سنتا ہے۔ دونوں شارکیں یا ان میں سے کوئی ایک جھوٹ جھوٹ کی گردان کرنے لگتی ہے۔

وہ ٹیپ ریکارڈ بند کر دیتا ہے اور ریڈیو سے خبریں سنتا ہے۔ شارکیں اب بھی باز نہیں آتیں۔ وہ لیٹے لیٹے پاؤں کی ٹھوکر سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیتا ہے۔ پٹ کے زور سے بند ہونے کی آواز سن کر شارکیں اڑ جاتی ہیں۔ اب ہنسنے کی اس کی باری ہے۔

تکیے کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے۔ سگریٹ منہ میں لے کر سلگانے لگتا ہے مگر پھر اسے یاد آتا ہے کہ آج چھٹی کا دن ہے اور باؤجی ابھی تک گھر پر ہوں گے۔ سگریٹ کی خوشبو سے انھیں فوراً پتہ چل جائیگا کہ اس نے سموکنگ پھر سے شروع کر دی ہے۔ کیا مصیبت ہے وہ جھنجھلا کر سوچتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے سگریٹ بھی نہیں پی سکتا۔ گردن کے نیچے دونوں ہاتھ باندھ کر لیٹ جاتا ہے اور دن بھر میں پیش آنے والے واقعات اور اپنی مصروفیات کا جائزہ لیتا ہے۔ ابھی جب وہ نیچے جائے گا۔ اسے بیکری سے انڈے اور ڈبل روٹی لانے کو کہا جائے گا۔ پھر اسے قصائی کی دکان پر بھیج دیا جائے گا مگر شاید آج نہیں کہ سب کا کھانا پڑوس والوں کے ہاں ہے۔ البتہ جب وہ ناشتہ کر رہا ہوگا تو ہر ایک کو اپنے کام یاد آنے لگیں گے۔ فلاں کے ہاں سے سلے ہوئے کپڑے لادو، فلاں کے گھر یہ پیغام دے آؤ۔ فلاں کو

چھوڑ آؤ فلاں کو لے آؤ۔ وہ موٹروں، تانگوں، بسوں، رکشاؤں اور ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے سائیکل سواروں سے بچتا بچاتا بڑی مشکل سے ایک مہم سے واپس آئے گا تو اسے کسی دوسری مہم پر روانہ کر دیا جائے گا۔ اسے آج پہلی بار احساس ہو رہا ہے کہ وہ یہ مہمیں سر کرتے کرتے اکتا چکا ہے اسے لگتا ہے جیسے وہ ان سب کا بیٹا، بھائی، دیور اور چچا نہیں زر خرید غلام ہے، باؤ جی تو پھر باپ ہیں انھوں نے اسے پیدا کیا ہے۔ اگرچہ کچھ احسان نہیں کیا، مگر حد یہ ہے کہ ان کے دوستوں کے دوست بھی اس پر حق رکھتے ہیں۔ اور جب اور جہاں چاہتے ہیں اسے بیگار میں پکڑ کر بھیج دیتے ہیں، وہ جیب خرچ سے بچا کر چند لیٹر پٹرول موٹر سائیکل میں ڈلواتا ہے کہ کہیں گھوم آئے مگر اسے بھابی کا سندیسہ لے کر ان کے میکے جانا پڑ جاتا ہے اور جب وہ ان کے میکے جاتا ہے تو بھابی کی بھابی اسے اپنی بھابی کے ہاں کسی کام سے روانہ کر دیتی ہیں اور تو اور منی اور پپو بھی اس پر حکم چلا لیتے ہیں۔ چچا ہمیں سیر کرا دو، ہمیں چڑیا گھر لے چلو۔ ہمیں آئس کریم کھلا دو۔

اس کی زندگی بھی کیا زندگی ہے وہ دکھ سے سوچتا ہے۔ گھر ہو یا دفتر ہر جگہ اس کے بہت سے آقا موجود ہیں جو اسے اپنا غلام سمجھ کر احکامات جاری کرتے ہیں اور جیسے اس کی اپنی کوئی پسند یا مرضی نہ ہو اس کی اپنی کوئی شخصیت نہ ہو ہر کوئی اس پر اپنی پسند اور مرضی ٹھونسنا چاہتا ہے۔ گھر میں جو پکا ہے وہ کھانا پڑتا ہے۔ جو دوسرے چاہیں وہ کرنا پڑتا ہے۔ دفتر کے جیسے بھی ضابطے ہوں یا ان میں کیسی بھی ترامیم ہوتی رہتی ہوں اسے موسٹ او بیڈینٹ سروِنٹ بن کر ان کی تعمیل کرنا پڑتی ہے تو گیا وہ دوسروں کے احکامات بجا لانے اور ان کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے پیدا ہوا ہے خود اس کا اپنے اوپر کوئی حق نہیں اسے کسی بات کا اختیار نہیں۔ افسوس اس نے آج سے پہلے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ کسی کو اس کے جذبات و محسوسات

جاننے کی پروا نہیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ وہ انھیں بتائے گا کہ اس کی اپنی آزاد اور خود مختار شخصیت ہے اور کسی کو اس کی آزادی سلب کرنے کا کوئی حق نہیں۔

وہ چونکتا ہے۔ منّی اخبار لے کر اندر آتی ہے اور تپائی پر رکھ کر چلی جاتی ہے۔ وہ اخبار اٹھا کر شہ سرخی پڑھتا ہے۔ شاید شارکیں کہیں پڑوس کے کسی چھجے پر جا بیٹھی ہیں دور سے ان کی آواز سنائی دیتی ہے

"جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ"

وہ اخبار اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتا ہے اور سگریٹ سلگا کر پینے لگتا ہے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا ہو اپنے بہت سے آقاؤں سے بغاوت کا علم بلند کر دیا ہو۔

اسی لمحے سامنے کے مکان کے چھجے پر ایک موٹا تازہ کوا آ بیٹھتا ہے اور بلند آواز سے کہتا ہے "دروغ"

وہ اٹھ کر کھڑکی کا دوسرا پٹ بھی بند کر دیتا ہے۔ پٹ بند ہونے کی آواز سے کوا اڑ جاتا ہے لیکن اسے لگتا ہے جیسے وہ چھجے سے اڑ کر اس کے اندر کی کسی منڈیر پر آ بیٹھا ہو اور اس کی ہر بات اور سوچ پر دروغ دروغ کی رٹ لگا کر پانی پھیرنے لگا ہو۔

تب بھابی اندر آتی ہیں اور اسے ایک نظر دیکھ کر کمرے میں بکھری چیزوں کو ٹھیک کرنے لگتی ہیں، وہ اخبار میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ وہ کہتی ہیں "اچھا ہوا تم جلدی اٹھ گئے ناشتہ کر کے مجھے آپا کے ہاں سے کپڑے لا دو انھوں نے ٹانک دیئے ہوں گے؟"

اس کا جی چاہتا ہے وہ ان سے پوچھے کہ کپڑے کس کے ہیں؟ لیکن پھر اسے خیال آتا ہے کہ جب اسے لا کر دینے ہی نہیں ہیں تو اسے اس سے کیا

غرض کہ کپڑے بھابی کے اپنے ہیں یا انھوں نے پڑوس والوں کے لیے بنائے ہیں۔

"بھابی آپ کسی اور سے منگوا لیجیے مجھے آج ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔"

"ایسا کون سا ضروری کام آ پڑا ہے تجھے آج کے دن؟"

"کیوں آج کیا ہے؟"

"آج —— تمھیں پتہ تو ہے بھیّا۔ آج کیا ہے۔ پڑوس میں تمھاری ضرورت ہوگی۔"

"میری کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔"

"پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ محلے داری ہے آخر۔"

"مجھے نہیں معلوم" وہ رکھائی سے کہتا ہے "آج مجھے فراغت نہیں۔"

بھابی کچھ دیر خاموش رہتی ہیں پھر کہتی ہیں۔

"تم مرد لوگ بہت بے حوصلہ ہوتے ہو اور خود غرض بھی۔"

"کیا مطلب؟"

"ذرا سی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہو اور بے چاری عورت۔"

"پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ رات تمھارے بھائی جان کے سر میں درد تھا۔ ساری رات خود سوئے نہ مجھے سونے دیا۔ حالاں کہ جب کبھی مجھے رات کو پتّے کا شدید درد بھی ہوتا ہے میں محض اس لیے ہائے وائے نہیں کرتی کہ ان کی نیند خراب نہ ہو۔"

"آپ بھائی جان کا غصّہ مجھ پر اتار رہی ہیں کیسے ہیں وہ۔"

"اب مزے سے سو رہے ہیں مجھے سر درد میں مبتلا کر کے۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کیا جواب دے۔ لیکن اس خیال سے کہ بات بڑھ نہ جائے، وہ نرم لہجے میں کہتا ہے۔

" میں جلد واپس آ جاؤں گا۔"

" اچھا چلو نہا دھو کر ناشتہ کر لو۔"

" میں ناشتہ بھی وہیں کروں گا مجھے جلدی ہے۔"

" اچھا جیسے تمہاری مرضی ــــ مگر موٹر سائیکل نہ لے جانا۔ تمہارے بھائی جان کو ضرورت ہوگی۔"

" جی اچھا۔"

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آتا ہے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلتا اور باہر جانے لگتا ہے اس کی والدہ کہتی ہیں

" جلدی آجانا بیٹے۔ بہت سے کام ہیں۔"

" کام کام کام" وہ زیر لب بڑبڑاتا ہے اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل جاتا ہے۔

گلی میں ابھی سے بہت شور اور بھاگ دوڑ شروع ہوگئی ہے۔ شامیانے لگ رہے ہیں۔ قناتیں تانی جا رہی ہیں۔ پیاز چھیلے جا رہے ہیں اور اینٹیں جوڑ کر بڑے بڑے چولہے بنائے جا رہے ہیں۔ اسے ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی کوئی اسے آواز دے کر بلا لے گا۔ وہ جلد از جلد ان آشنا لوگوں اور آوازوں سے دور چلا جانا چاہتا ہے۔

تھوڑی دور جا کر گلی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے وہ پہلے دائیں جانب کو قدم بڑھاتا ہے پھر کچھ سوچ کر بائیں جانب کو مڑ جاتا ہے۔ ابھی دکانیں نہیں کھلیں ویسے بھی آج چھٹی کا دن ہے صرف دودھ دہی بیکری۔ قصاب اور حجاموں کی دکانیں کھلی ہیں۔ دینو حلوائی کی دکان پر نہاری اور حلوہ پوری خریدنے والوں کا ہجوم ہے۔ اس کا جی نہاری کھانے کو چاہتا ہے مگر وہ جلد از جلد اپنی آزادی

میں مخل ہونے والے جان پہچان کے لوگوں سے دور نکل جانا چاہتا ہے۔

سڑک پر پہنچ کر اپنی طرف والے بس اسٹاپ پر کھڑا ہو جاتا ہے مگر پھر یہ دیکھ کر دوسری جانب جانے والی بس پہلے آ گئی ہے۔ وہ سڑک پار کر کے جلدی سے بس پر سوار ہو جاتا ہے۔ بس کنڈیکٹر ٹکٹ کے لیے کہتا ہے تو فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس جگہ کا ٹکٹ خریدے لیکن ساتھ والا مسافر ریلوے سٹیشن تک کا ٹکٹ مانگ کر اس کی مشکل آسان کر دیتا ہے۔

ریلوے سٹیشن کے سامنے فٹ پاتھ پر چلتے ایک میلا کچیلا لڑکا جس کے جسم پر صرف ایک قمیض ہے۔ اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔

"کیوں مانگتے ہو؟"

"بھوکا ہوں۔"

"کیوں بھوکے ہو؟"

"میرے ماں باپ نہیں ہیں۔"

"اچھا ہے نہیں ہیں۔" وہ کہتا ہے "اگر ہوتے تو تم اپنی مرضی سے بھیک بھی نہیں مانگ سکتے تھے۔"

وہ لڑکے کو کچھ پیسے دیتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر بہت رونق ہے۔ لوگ آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ انکوائری سے معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ قلیوں کو پیسے دے رہے ہیں۔ اپنے عزیز و اقارب سے گلے مل رہے ہیں۔ وہ مختلف گاڑیوں کے اوقات اور کرائے نامے پڑھنے لگتا ہے اس کا جی چاہتا ہے کسی اپ ٹرین میں بیٹھ کر چچا کے ہاں چلا جائے لیکن پھر اس خوف سے کہ اس کے پاس اپنی چچازاد کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں وہ ارادہ بدل لیتا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ کسی ڈاؤن ٹرین کے ذریعے ماموں کے ہاں چلا جائے۔ مگر پھر اسے ممانی کی تیوری کے بل یاد آ جاتے ہیں اور وہ کچھ بھی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر

آجاتا ہے اور ایک چکر لگاتا ہے۔ پھر چائے کے اسٹال پر رک کر ناشتہ کرتا ہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ایک بنچ پر آ بیٹھتا ہے اور گاڑی کا انتظار کرنے لگتا ہے تھوڑی دیر بعد گاڑی آجاتی ہے۔ وہ ہجوم سے ہٹ کر کھڑا ہو جاتا اور چڑھنے اور اترنے والوں کو خالی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے پھر جب گاڑی چلی جاتی ہے پلیٹ فارم خالی ہو جاتا ہے تو وہ دوبارہ اسی بنچ پر آ بیٹھتا اور دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں سوچ کا ایک چیونٹا کلبلاتا ہے کہ جب اسے معلوم ہی نہیں کہ اسے کہاں جانا ہے تو وہ ایک گاڑی کے چلے جانے کے بعد دوسری اور پھر تیسری گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اٹھ کر ریلوے اسٹیشن سے باہر آتا ہے۔ چوک پر پہنچ کر کچھ دیر سوچتا ہے پھر بڑے بازار کی طرف چل دیتا ہے۔

تھوڑی دور جا کر اسے اپنا ایک دوست مل جاتا ہے علیک سلیک کے بعد وہ اس سے ضروری کام کا بہانہ کر کے رخصت ہوتا ہے اور کھلی اور بند دکانوں کے آگے سے گزرتا اور بڑے چوک پر آجاتا ہے۔ یہاں پرانی کتابوں کے اسٹال ہیں وہ ایک اسٹال پر رک کر کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے۔ پھر دو رویہ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر چلنے لگتا ہے۔

چڑیا گھر کا بورڈ دیکھ کر رک جاتا ہے۔ پھر ٹکٹ خرید کر چڑیا گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ چڑیا گھر میں جانوروں اور پرندوں کو کٹہروں اور پنجروں میں بند دیکھ کر اس کا دم سا گھٹنے لگتا ہے۔ وہ جلد از جلد اس ماحول سے نکل جانا چاہتا ہے کہ شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ شیر کی آواز سن کر چاروں طرف سے تماشائی اس کے کٹہرے کے سامنے جمع ہونے لگتے ہیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ شیر فرش پر بیٹھا تماشائیوں کے ہجوم اور قید کی ایک جیسی زندگی سے اکتا کر زور زور سے دھاڑ رہا ہے وہ تماشائیوں سے جس قدر بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اتنے ہی زیادہ تماشائی جمع ہوتے جاتے

ہیں۔ پھر ایک عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ شیرنی اپنی جگہ سے اٹھتی ہے اور اس کے قریب آکر اپنا سر اس کے سر سے رگڑتی ہے جیسے دلاسہ دے رہی ہو اور شیر کی آواز رفتہ رفتہ تھم جاتی ہے۔ اسے بھابی کی بات یاد آتی ہے کہ تم مرد لوگ بہت بے حوصلہ ہوتے ہو۔ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہو اس کا جی چاہتا ہے تمام پنجروں کے پٹ کھول کر چڑیا گھر کے سبھی جانوروں اور پرندوں کو آزاد کر دے مگر پھر اسے کمزور جانوروں کا خیال آتا ہے۔ جو کٹہروں سے نکلتے ہی طاقت ور درندوں پرندوں کا لقمہ بن جائیں گے وہ آگے بڑھتا اور ہرنیوں کو ریلنگوں اور خاردار تاروں سے گھرے جنگلے میں بے فکری سے ٹہلتے دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ جنگل کی نسبت یہاں کس قدر محفوظ ہیں۔ کسی چیتے کی گھات کا ڈر نہ کسی شکاری کی بندوق کا خوف، تو کیا کمزوروں کی بقا صرف قید اور غلامی ہے اور وہ آزادی کا ایک دن بھی چین اور اطمینان سے نہیں گزار سکتے؟ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا اور جھنجھلا کر باہر نکل آتا ہے۔

دوپہر ڈھلنے لگی ہے اور اسے بھوک ستا رہی ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں داخل ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ پھر سگریٹ کے کش لگاتا ہوا باہر آتا اور سڑک کے کنارے ایک اونچی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا سگریٹ سلگاتا اور گزرنے والی گاڑیوں کے نمبر پلیٹیں پڑھنے لگتا ہے۔

اچانک اسے خیال آتا ہے کہ وہ حساب لگا کر دیکھے ایک گھنٹے میں مختلف اقسام اور ماڈلوں کی کتنی گاڑیاں وہاں سے گزرتی ہیں۔ اس سے چوبیس گھنٹوں میں وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں کا اوسط نکالنے میں آسانی رہے گی۔ پھر وہ ایک ماہ اور پھر ایک سال کا اوسط نکالتا ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب ان اعداد و شمار کا کیا کرے؟"

دیوار پر چڑھ کر بیٹھے اور گاڑیوں کی تعداد گنتے گنتے سہ پہر ہو جاتی ہے، درختوں کے سائے لمبے ہو جاتے اور گرمی کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔ وہ

ایک طرف کو سایہ دار درختوں کے نیچے چلتا رہتا ہے اور شہر کی سب سے بڑی سیرگاہ میں داخل ہوتا ہے سیرگاہ میں خوش لباس لوگ اور خوب صورت بچے ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ اسے بچے اچھے لگتے ہیں وہ انھیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ مصنوعی آبشاروں سے گزرتا پانی اور چاروں طرف کھلے ہوئے رنگ برنگ خوشنما پھول دیکھ کر اس کے اندر کی گھٹن کم ہونے لگتی ہے۔ اسی لمحے ایک خوبصورت عورت اس کے قریب سے گزرتی اور اسے میٹھی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ یقیناً وہ بھی اس کی طرح تنہا اور ویران ہوگی۔ اور اس نے بھی انھی دنوں اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا ہوگا۔ مگر پھر اسے مصنوعی جھیل کی طرف پرواز کرتے پرندوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

"جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ"

"ریا، ریا، ریا"

"دروغ دروغ دروغ"

اس کے اندر درد کی ٹیسیں جاگتی ہیں۔ وہ پھولوں اور بچوں کی طرف توجہ دینا چاہتا ہے۔ مگر درد کی ٹیسیں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ وہ تھکے ہوئے پاؤں اٹھاتا مین گیٹ کی طرف چل دیتا ہے۔

اس کی جیب میں کرایہ موجود ہے لیکن وہ پیدل چلتا ہے۔ سڑکوں، بازاروں اور گلیوں میں گھومتا۔ مکانوں پر لگی نیم پلیٹوں اور دکانوں کے سائن بورڈ پڑھتا چلتا رہتا ہے۔ پھر اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب اور کیسے وہ دروغ بھرے دن کے غروب ہونے پر اپنے گھر کی گلی میں داخل ہوگیا۔ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکتا ہے پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلنے لگتا ہے۔ گلی میں آوارہ کتے جگہ جگہ ہڈیاں چچوڑ رہے ہیں۔ شامیانے اور قناتیں ہٹائی جا چکی ہیں اور اس کے گھر کے سامنے والے چھجے پر کوئی پرندہ موجود نہیں ہے۔ وہ تھکا ہارا نڈھال سا گھر میں داخل ہوتا ہے تو سب لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

"کہاں تھے تم؟" والدہ پوچھتی رہیں۔
"سارا دن کہاں غائب رہے؟" بہن کہتی ہے۔
"ایسا کون سا ضروری کام آ پڑا تھا؟" بھائی گرجتا ہے۔
باؤجی غصے میں کمرے سے باہر آتے ہیں اور کہتے ہیں۔
"صبح کے گئے ہوئے تم پورا دن ضائع کر کے اب آ رہے ہو تمہیں شرم آنی چاہیے۔"
"شرم کس بات کی باؤجی" وہ غصے سے کہتا ہے۔" کیا مجھے اپنی زندگی کا ایک دن بھی اپنی مرضی سے گزارنے یا ضائع کرنے کا اختیار نہیں؟"
بھابی قریب آتی ہیں اور چڑیا گھر کی شیرنی کی طرح اس کے سر کے ساتھ اپنا سر جوڑ کر کہتی ہیں "تم تو مرد ہو دل بڑا کرو بھیا —— آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"اب کیا رہ گیا ہے جو ٹھیک ہو جائے گا۔"
وہ ضبط کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر کئی دنوں کا روکا ہوا رونا ضبط کے سارے بندھن توڑ دیتا ہے۔ گھر کے سب لوگ سہم سے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں ان پوچھے سوال کا جواب تلاش کرنے لگتے ہیں۔

لوہے کا آدمی

چلتے چلتے اچانک اس پر نظر پڑتی ہے۔ میں اسے فوراً پہچان لیتا ہوں۔

"ارے واہ ــــ تم یہاں" میں خوشی اور حیرت سے کہتا ہوں۔

وہ کوئی جواب نہیں دیتا ــــ دے بھی نہیں سکتا۔ برسوں بعد اسے اچانک دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے جیسے پردیس میں کوئی بچھڑا ہوا عزیز مل گیا ہو۔

مَیں کل شام سے اس شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہوں۔ کل دیر سے ایرپورٹ پہنچنے کی وجہ سے میری فلائیٹ نکل گئی۔ میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ میں نے وقت گزارنے کے لیے شہر کی تقریباً سب اہم جگہیں دیکھ ڈالی ہیں لیکن میری اگلی فلائیٹ میں اب بھی اٹھارہ گھنٹے باقی ہیں۔

اس وقت میں بڑے بازار کا چکر لگا کر واپس ہوٹل کی طرف جا رہا تھا کہ ایک چھوٹے سے ریستوران کے سامنے میری اس پر نظر پڑی ہے اور میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا ہے کیسے نہ پہچانتا، میرا اس کا بارہ برس تک ساتھ رہا ہے۔ پھر ایک بار مجھے کچھ رقم کی ضرورت پڑ گئی اور میں نے اسے اپنے شہر کے ایک ڈیلر کے ہاتھ فروخت کر دیا اور بھول گیا۔ لیکن اب تین چار برس بعد اسے اچانک یہاں دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے جیسے میں خود اسے یہاں کھڑا کر کے تھوڑی

دیر کے لیے اِدھر اُدھر چلا گیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اس خوشی کا اظہار کیسے اور کس سے کروں جو اسے اس اجنبی شہر میں دیکھ کر مجھے ہو رہی ہے۔ اس کا موجودہ مالک یقیناً اندر بیٹھا چائے پی رہا ہوگا۔ وہ کسی وقت بھی باہر آسکتا اور اسے وہاں سے لے جاسکتا ہے۔ میں یہ سوچ کر اداس ہو جاتا ہوں کہ پتہ نہیں کب ہماری اس ملاقات کا وقت ختم ہو جائے۔

مَیں آگے بڑھ کر اسے چُھوتا ہوں اور میرے اپنے بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے۔ مَیں فرطِ محبت میں اس پر ہاتھ پھیرتا ہوں اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کے کان کھڑے ہو گئے ہوں اور وہ اندر ہی اندر زور زور سے ہنہنانے لگا ہو۔

کلچ کافی سخت ہو رہا ہے شاید اسے گریس کی ضرورت ہے۔ سٹینڈ میں بھی کچھ نقص معلوم ہوتا ہے کیوں کہ وہ ایک طرف کو جھکا کھڑا ہے۔ کافی جگہوں سے روغن اکھڑا ہوا ہے۔ ہینڈل پر وہ ڈنٹ صاف نظر آتا ہے جو ایک بار کھمبے سے ٹکرانے کی وجہ سے پڑا تھا۔ پھر بھی اس کی مجموعی حالت زیادہ خراب نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کے اندر پٹرول کی بجائے لہو گردش کرتا ہوتا تو وہ میری حالت دیکھ کر ضرور رو پڑتا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے بہت سے سوالات بھی پوچھتا۔ بچھڑ جانے والوں کا حال احوال دریافت کرتا۔ وہ ان حادثوں کی تفصیل بھی جاننا چاہتا جنھوں نے میرے اندر باہر ڈنٹ ڈال دیے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مَیں بھی اس سے وہ سب کچھ کہتا جو کسی سے نہیں کہہ سکتا ہوں مگر وہ کچھ بھی نہیں پوچھتا وہ مجھے دیکھ کر نہ ہنسا ہے نہ رویا ہے اور نہ ہی اس کے کسی حصے میں کوئی جنبش ہوئی ہے۔

مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب میں اسے خرید کر لایا اور اس پر پہلی بار سوار ہوا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے میرے پر نکل آئے ہوں۔ کئی برسوں پہلے روزانہ گھر

سے سکول تک کا بارہ میل کا فاصلہ پیدل چلتے چلتے جب مجھے پھٹیچر سی بائیسکل ملی تھی تب بھی ایسا ہی لگا تھا مگر بائیسکل نئی ہو یا پرانی چلنے کے لیے انسانی خون کا ایندھن مانگتی ہے۔ برسوں تک پیڈل مار مار کر میری ٹانگوں کا خون خشک ہو گیا اور نہ جانے کتنے ہی بعد میں روانہ ہونے والے مجھ سے آگے نکل نکل گئے۔

مجھے یاد آتا ہے اسے خریدنے کے لیے مجھے کتنی محنت اور انتظار کرنا پڑا تھا۔ پہلی تنخواہ ہی سے میں نے اس کے لیے پیسے بچانا شروع کر دیے تھے اور کئی برسوں کا اوور ٹائم ملا کر اس تک پہنچ سکا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا ہوا تھا کہ نیا ہی خریدوں گا۔ آدمی کے پاس کوئی چیز تو نئی بھی ہونی چاہیے۔ مجھے زندگی میں ہر چیز پرانی اور سیکنڈ ہینڈ ملی تھی۔ بڑے بھائیوں کے چھوٹے پڑ جانے والے کوٹ، سویٹر اور کپڑے۔ ان کے گھسے ہوئے تلووں والے جوتے۔ ان کی پڑھ پڑھ کر پھاڑی اور میلی کی ہوئی کتابیں۔ چھوٹا ہونے کے ناتے میرے لیے بازار سے بھی پرانی اور سیکنڈ ہینڈ چیزیں خریدی جاتیں۔ نئی اور تازہ چیزوں کے لیے میں ہمیشہ سے ترسا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے جو محبت ملی وہ بھی فرسٹ ہینڈ نہیں تھی لیکن اسے دیکھ کر میرے اندر کوئی کان پر ہاتھ رکھ کر اونچے سروں میں مرزا صاحباں گانے لگتا تھا۔ ؎

دھی کھیوے دی صاحباں جس تے حوراں گھنڈ کڈھن
اوہدے پٹ چنن دیاں گیلیاں کھہ کھہ مُشک چھڈن
اوہدے خونی نین پکھا وے بازاں وانگ تکن
اوہ پاڑن وَل وَل دلاں نوں بکیں رت پیون
اوہدے سر تے بھوچھن کا ہڈھواں وچ تلیئر چوگ چُگن

وہ بچپن ہی سے اپنے تایا زاد سے منسوب تھی اور اس کے لیے کتابوں رسالوں سے اشعار چنتی اور اسے بھجواتی رہتی تھی اور وہ ہر صبح اس کے سرہانے بہت سے پھول اور کلیاں ڈال جایا کرتا تھا۔ لیکن پھر دونوں

گھروں کے درمیان جائیداد کا جھگڑا شروع ہوا اور آئے دن گالی گلوچ کی آندھیاں اور طعنوں مہنوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ چہروں پر نفرتوں اور کدورتوں کی گرد جمنے لگی اور دل محبتوں سے خالی ہونے لگے۔ ایسے ہی خزاں کے کسی موسم میں جب اس کے دل کا شجر بے برگ و بار ہو رہا تھا۔ اس نے کسی اجنبی پرندے کی چہکار سنی۔ وہ اسے بار بار اڑاتی مگر وہ لوٹ لوٹ کر آجاتا اور ننگی ٹہنیوں پر بیٹھ کر چہچہانے لگتا۔ قریب رہنے والی چیزوں سے اُنس ہو ہی جاتا ہے وہ اسے دانہ دُنکا ڈالنے لگی۔

مجھے یاد آتا ہے۔

جب میں اچانک بریک لگاتا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ میرے ساتھ آلگتی تھی اور میری زرہ بکتر کا لوہا پگھلنے لگتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے شوز بدلوانا پڑ جاتے تھے۔

مَیں چونک پڑتا ہوں۔

ریستوران سے نکل کر ایک دُبلا پتلا آدمی اس طرف کو آ رہا ہے۔ شاید اس سے بچھڑنے کی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ میں ایک طرف کو ہٹ جاتا ہوں مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ کچھ دیر اور اس کے ساتھ گزار سکوں گا۔ بھولی بسری باتوں کو یاد کر سکوں گا۔ بعض زخم ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی انھیں کھرچ کر خوش ہوتا ہے۔

ایک بار میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر مجھے ہوش میں لانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے مگر ہوش نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں نے ایک بوڑھی اور نحیف آواز سنی۔ اپنی ماں کی۔ پتہ نہیں کیسے بے ہوشی کے تنے ہوئے تنبو کو پھاڑ کر اس کی سسکی کی لاغر سی آواز میری اندر گھس گئی تھی اور میں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب ہم لمبی سیر سے لوٹے تھے۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے کہا تھا۔

"یہ گھر اتنی جلدی کیسے آگیا ہے؟"
"کہو تو واپس چلیں؟"
"ہاں چلو۔"
اور ہم واپس چلے گئے تھے۔

ایک دفعہ وہ صبح کی گاڑی سے ننھیال جارہی تھی۔ اس نے مجھے اسٹیشن پر آنے کو کہا تھا۔ لیکن میں ناراض تھا۔ دو روز پہلے ہماری کسی بات پر چھوٹی سی لڑائی ہوگئی تھی۔ میں اتنی جلدی من جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہورہی تھی کہ وہ بار بار خالی پلیٹ فارم کو دیکھ کر پریشان ہوتی ہوگی۔ وہ مجھے لوہے کا آدمی کہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تھوڑی سی عمر میں بہت ساری صعوبتیں برداشت کرکے میری کھال ہی نہیں دل بھی سخت ہوگیا تھا۔ وہ بہت جلد غصّے میں آجاتی لیکن پھر فوراً ہی من جاتی تھی۔ مجھے غصہ نہیں آتا تھا مگر دل میں بدگمانی یا ناراضی کی ذراسی خراش بھی پڑجاتی تو اسے مٹاتے کے لیے مجھے کئی کئی دن کی مہلت درکار ہوتی۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر خوش ہوجاتی تھی، اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو پڑتی تھی۔ وہ ناول یا افسانہ پڑھ کر اور فلم کا المیہ سین دیکھ کر رو پڑتی تھی۔ اس کے برعکس مجھے کبھی کسی بڑے سے بڑے حادثے پر بھی رونا نہیں آیا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی۔

"رونے والی بات پر رو پڑا کرو، اس سے دل کا میل ڈھل جاتا ہے۔"
میں کوشش کرتا مگر مجھے رونا نہ آتا۔ ہنسی بھی نہ آتی۔ ہاں اکثر خوف آتا رہتا ——— اپنے آپ سے۔

میں اسٹیشن نہیں جانا چاہتا تھا۔ دل میں ایک آدھ سلوٹ ابھی باقی تھی۔ لیکن پھر پتہ نہیں کیا ہوا جب گاڑی چلنے کا وقت قریب آیا میرے اندر ایک انجن سا زور زور سے بھاپ نکالنے لگا۔ مگر اس روز کوئی میرے اسٹیشن پہنچنے کی وڈیو ریکارڈنگ کررہا ہوتا تو اتنا طویل فاصلہ اتنے کم وقت میں طے کرنے پر مجھے کوئی

بڑا عالمی ایوارڈ دیا جاتا یا پھر تیز رفتاری اور ٹریفک اصولوں کی خلاف ورزی کے جرم میں میرا لائسنس ضبط کر لیا جاتا۔ یوں لگتا تھا میں اسٹیشن نہیں تیلی پر ہو کر دانا باد جا رہا تھا۔

اوہدیاں قلماں وانگ کنوتیاں اتّے سوہے سبز پلان

اوہدے سنباں لاٹاں چھڈیاں جیوں آہرن پین ودان

بعد میں اس نے خود ہی بتایا تھا کہ وہ مجھ سے بہت مایوس ہو چکی تھی اور اگر میں اس روز اسٹیشن نہ جاتا تو اس نے میرے لوہے کا آدمی ہونے پر پکّی مہر لگا دینا تھی اور عین ممکن تھا کہ وہ میری سیکنڈ ہینڈ محبت کو اپنے ننھیال میں کوڑیوں کے بھاؤ بیچ آتی۔

مجھے یاد آتا ہے۔

سہ پہر کی سنہری دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"کیا تمھیں بہت جلدی ہے؟"

"نہیں تو۔"

"پھر آہستہ کیوں نہیں چلاتے؟"

"کیا تمھیں ڈر لگتا ہے؟"

"ہاں — اس بات سے کہ یہ سفر جلد ختم ہو جائے گا۔"

"اچھا تمھارا مطلب ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"میرا کچھ بھی مطلب نہیں۔" وہ جل کر بولی "بس تم اڑ کر پہنچ جاؤ۔"

"بھئی چڑھائی جو ہے آہستہ چلاؤں گا تو کیسے چڑھیں گے۔"

"میرا تو جی چاہ رہا ہے وقت تھم جائے بس ہم اسی طرح ...." اس نے سر میرے کندھے سے ٹکا دیا اور کہنے لگی۔ "یہ جو سامنے بلند اور مٹیالا پہاڑ ایستادہ ہے اسے یاد رکھنا۔"

"کیوں اس کے اندر کوئی خزانہ چھپا ہوا ہے؟"

"ہاں ——— اسے یاد رکھنا۔ اس کی استقامت کو یاد رکھنا۔"
پھر وہ بلند آواز میں پکاری۔
"پہاڑ ——— تو گواہ رہنا۔"
اس کی آواز چٹانوں سے ٹکرائی، لوٹ کر آئی پھر منظر کا حصہ بن گئی۔ مجھے محسوس ہوا وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ اس میں یہ بڑی خرابی تھی۔ وہ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیکھ کر رومینٹک ہو سکتی اور محض اداسی کا خیال کر کے اداس ہو سکتی تھی۔
اگلے موڑ پر اس نے رُکنے کی فرمائش کی۔ میں رُک گیا اور ایک طرف کھڑے ہو کر ٹوکری سے پھل نکال کر کھانے لگا وہ بولی۔
"ایک تو تم پیٹو بہت ہو ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں رہتے ہو خدا کے بندے ادھر سامنے تو دیکھو۔"
"کیا ہے ادھر؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "بادل ہیں پہاڑ ہے سبزہ اور جنگل ہے۔ سب کچھ ویسا ہی تو ہے جیسا ہونا چاہیئے۔"
"اور وہ نیچے بہتی ندی اور وہ۔" وہ رک گئی پھر بولی۔ "یہ تم میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"
"سچ پوچھو تو مجھے اس وقت بھی تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔ میرے لیے ان سب مناظر کی اگر کوئی اہمیت ہے تو بس یہ کہ تم ان کے درمیان موجود ہو۔"
"افوہ بھئی میں کہیں بھاگ تو نہیں جا رہی جو تم ندیدوں کی طرح مجھے ہی گھورے جا رہے ہو۔"
"میں نے سنا ہے تمہارے گھروں میں صلح ہو گئی ہے؟"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"
"پڑ سکتا ہے۔"
"نہیں۔"
"سچ؟"

"ہاں۔"

میں چونکتا ہوں۔

ادھیڑ عمر کا بھاری جسم کا ایک شخص قریب کھڑا مجھے شک بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں لیکن وہ اس کا موقع نہیں دیتا۔ چابی گھما کر ہینڈل سیدھا کرتا اور کِک لگاتا ہے اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا ہوا ایک طرف کو چلا جاتا ہے۔

میرا دل کسی انجانی زنجیر میں بندھا کھنچا چلا جاتا ہے۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں اس کی سرخ بتی دکھائی دیتی رہتی ہے پھر آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

میرے اندر بہت سی چھوٹی بڑی گراریاں چلنے لگتی ہیں۔ میں خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن آدمی آخر آدمی ہوتا ہے چاہے لوہے کا ہو۔ اس کے اندر پٹرول نہیں لہو جلتا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ عجیب خفت سی محسوس ہوتی ہے لیکن پھر مجھے یاد آتا ہے کہ رونے والی بات پر رو لینا چاہیے اس سے دل کا میل دھل جاتا ہے اور میں کہ کبھی نہیں رویا تھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہوں۔

گیارھواں میل

"آخر بات کیا ہوئی تھی انھوں نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا؟"

"بس یار کیا بتاؤں بڑی معمولی بات تھی مگر کچھ عجیب سی۔"

"مجھے پوری بات بتاؤ۔"

"پہلے تمھارے لیے چائے نہ بنالاؤں؟"

"گولی مارو چائے کو —— یہ کوئی چائے پینے کا موقع ہے مجھے تو سونا گھر دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے۔"

"مگر یہ تو لمبا قصّہ ہے۔"

"اوہو تم شروع کرو گے تو ختم ہو گا نا"

"اچھا سنو —— یہ تو تمھیں پتہ ہی ہے کہ میں ضعیف العقیدہ آدمی نہیں ہوں۔"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے آپ نے طبیعات میں ایم ایس سی کیا ہے۔"

"یار میرا مطلب یہ نہ تھا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں غیر عقلی اور فوق الفطری باتوں کو اہمیت نہیں دیتا۔"

"اچھا تو بھابی نے کوئی غیر سائنٹیفک بات کہہ دی؟"

"تم سنو تو —— میں کہہ رہا تھا کہ اگرچہ میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا مگر

زندگی میں بعض واقعات پیش آتے ہیں کہ آدمی ان کی کوئی منطقی یا سائنسی ترجیح نہیں کر سکتا۔ یہ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہے۔"

"میں سن رہا ہوں۔"

"شہر سے مغرب کی طرف نہر والے پل سے ایک سڑک میرے ننھیالی گاؤں کو جاتی ہے۔ میں اس سڑک پر جب بھی سفر کرتا گیارھویں اور بارھویں میل پتھر کے درمیان کوئی نہ کوئی چھوٹا یا بڑا، معمولی یا غیر معمولی واقعہ ضرور پیش آتا۔"

"اچھا یا برا؟"

"عموماً ناخوشگوار ـــــ اس بات کا احساس مجھے کئی برسوں کے تجربے اور مشاہدے کے بعد ہوا۔ اگر میں بس پر سوار ہوتا تو اس کا ٹائر پنکچر ہو جاتا، یا بریک فیل ہو جاتے اور وہ حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچتی۔ اگر میں سکوٹر یا موٹر سائیکل پر سفر کرتا تو سڑک کے اس ٹکڑے پر کسی جگہ پلگ میں کچرا آجاتا۔ یا کلچ یا گیئر کی تار ٹوٹ جاتی۔ ایک دفعہ مجھے اسی جگہ تیز آندھی نے آلیا اور میں کھائی میں گرتے گرتے بچا۔"

"کافی پرانی بات ہے جب تمہارے پاس سکوٹر تھی۔"

"ہاں ـــــ جب میں نے گاڑی خرید لی اور ایک بار گرمی کی چھٹیوں میں بیوی بچوں کو لے کر گاؤں گیا تو عین گیارھویں اور بارھویں میل کے درمیان پہنچ کر انجن سے دھواں نکلنے لگا اتر کر دیکھا تو ریڈی ایٹر میں سوراخ ہو گیا تھا اور سارا پانی بہہ چکا تھا۔"

"اس کھٹارہ کو لمبے روٹ پر لے جانے سے پہلے اچھی طرح چیک کرا لینا تھا یہ تو تمہاری اپنی غلطی تھی۔"

"ہاں میری غلطی تو تھی مگر سوال یہ ہے کہ عین اسی جگہ پہنچ کر کیوں ایسا ہوا۔ پھر یہی نہیں۔ اس روز ہم وہاں سے بار بار پانی ڈالتے گاؤں پہنچے۔ اگلے روز گاڑی ٹھیک کرائی۔ مگر واپسی پر پھر اسی جگہ پہنچ کر فین بیلٹ ٹوٹ گیا۔ کہو یہ

بھی میری غلطی تھی ؟ "

" اچھا خیر پھر کیا ہوا ؟ "

" اس طرح کے واقعات جب بار بار پیش آئے تو میں چونکا اور سڑک کے اس حصّے پر سفر کرتے ہوئے ڈرنے اور محتاط رہنے لگا۔ ایک دفعہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا اور ہم بس میں بیٹھے خطرے کی حد پار کر رہے تھے کہ کسی مسافر کا کنڈیکٹر سے پیسوں کے لین دین پر جھگڑا ہو گیا اور مسافر نے غصّے میں آکر ایسی غلیظ گالی بک دی کہ اپنی چھوٹی بہن کی موجودگی کی وجہ سے مجھے شرم سے پسینہ آگیا۔"

" بھئی خوب —— یہ بھی اس سڑک کا قصور تھا گویا۔"

" میں نہیں جانتا کس کا قصور تھا۔ مگر سڑک کا یہ ٹکڑا میرے لیے ایک خاص اہمیت اختیار کر گیا۔ مجھے بُرے بُرے خیالات ستاتے، کہیں اس جگہ کی مٹی مجھے اپنی طرف تو نہیں بلاتی اور کہیں آخر کار کسی حادثے کا شکار ہو کر مجھے یہیں کہیں ہلاک تو نہیں ہو جانا۔ اور اگر ایسا تھا تو یہ قبل از وقت اشارے کون کرتا تھا اور کیوں۔ ظاہر ہے میں اس سڑک پر سفر کرنا ترک نہیں کر سکتا تھا زیادہ نہیں تو نیکی بدی کے موقعوں پر تو ننھیال جانا ہی پڑتا تھا۔ پھر بھی میری کوشش ضرور ہوتی گھوم پھر کر کسی اور رستے سے جاؤں اور اگر جانا ایسا ضروری نہ ہو تو ملتوی کر دوں۔"

" مگر تم نے کبھی مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا ؟ "

" ہاں —— میں اسے اپنا وہم ہی سمجھتا تھا۔ تم سے کہتا تو تم بھی اسے میرا وہم ہی سمجھتے۔"

" میں تو اب بھی یہی سمجھتا ہوں یہ سارا نفسیاتی مسئلہ ہے اگر تم اس سڑک پر سفر کے دوران میں اپنی حسیات کو اس قدر بیدار نہ رکھتے اور ہر لمحے چوکنّے نہ رہتے تو تمھیں بہت سی ناخوشگوار باتوں کو سڑک کے اس ٹکڑے سے وابستہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ اچھا خیر تم آگے بتاؤ پھر کیا ہوا۔"

" میں نے شعوری طور پر کوشش شروع کر دی۔ دورانِ سفر خود کو مطالعے میں

مصروف رکھتا یا آنکھیں بند کر لیتا اس کے باوجود کچھ نہ کچھ ہو جاتا۔ بعض اوقات تو بہت ہی معمولی سی بات ہوتی کوئی مسافر بس پر چڑھتے یا اترتے ہوئے پاؤں کچل دیتا یا کوئی ہم سفر کھڑکی سے باہر تھوکتا تو ہوا سے تھوک اڑ کر میرے منہ پر آ پڑتا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے وہم سے چھٹکارا پانے کی کوشش جاری رکھی۔"

"تم وہاں کبھی اترے نہیں۔ میرا مطلب ہے اس علاقے میں گھوم پھر کر نہیں دیکھا کہ تاریخ جغرافیہ کیا ہے؟"

"کئی بار ارادہ کیا کہ اس پورے علاقے کا سروے کروں اور آس پاس کی آبادیوں، ویرانوں، قبرستانوں اور لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں اور اندازہ لگاؤں کہ میرا اس علاقے سے کیا تعلق ہے اور یہ بھی دیکھوں کہ کہیں کوئی تخریبی طاقت تو جاگزیں نہیں ہے۔ کتابوں میں پڑھی اور سنی سنائی فضول فضول باتیں ذہن میں آتیں کوئی دشمن یا حاسد مجھے نقصان پہنچانے کے لیے وہاں بیٹھا چلّہ نہ کاٹ رہا ہو۔ جادو ٹونا نہ کر رہا ہو۔"

"آخر آ گئے نہ راہِ راست پر۔"

"بالکل نہیں۔ میں ایسی باتیں سوچتا ضرور تھا مگر مجھے اب بھی ایسی باتوں پر یقین نہیں ہے۔ اس وقت بھی نہیں تھا بس یوں سمجھ لو یقین نہ رکھتے ہوئے بھی شک اور موہوم سا ایک خدشہ دل کے کسی کونے میں موجود تھا۔"

"پھر کیا ہوا۔"

"پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں ننھیال سے ایک گھی کا ٹین لے کر لوٹ رہا تھا۔ کنڈیکٹر نے اسے چھت پر رکھوا دیا تھا اور مجھے بتا دیا تھا کہ شہر کی محصول چونگی پر اتر کر اس کا محصول ادا کرنا ہوگا۔"

"ہاں سات نمبر چونگی آتی ہے اس سڑک پر۔"

"ہاں وہیں سات نمبر چونگی پر محصول ادا کرنے کے لیے اترا۔"

"وہ تو شہر کے باہر تیسرے چوتھے میل پر واقع ہے اس کا اس گیارھویں میل

سے کیا تعلق۔"

"تم سنو تو ——"

"چلو کہو۔"

"محصول دینے لگا تو احتیاطاً ایک نظر گھی کے ٹین کو دیکھ لینا چاہا مگر یہ جان کر میرے ہوش اڑ گئے کہ بس کی چھت پر ٹین موجود نہیں تھا۔ کنڈیکٹر اور مسافروں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ دو سٹاپ پیچھے جو سواریاں اتری تھیں۔ انھوں نے گھی کے کچھ کنستر اتارے تھے۔ کنڈیکٹر نے ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"

"جب وہ لوگ اپنے اور تمھارا کنستر اتار رہے تھے تم کہاں تھے؟"

"یار میں اس سڑک کی نحوست سے خود کو بچانے کے لیے آنکھوں پر رومال رکھے اونگھ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا بے خبری میں سڑک کا وہ حصہ گزر جائے۔"

"بے خبری میں مبتلا ہونے میں تو تم خوب کامیاب ہوئے۔"

"خیر ڈرائیور اچھا آدمی تھا کچھ سواریوں نے بھی ہمدردی کا اظہار کیا اور وہ بس واپس لے جانے پر رضامند ہو گیا اور مجھے گیارھویں اور بارھویں میل کے درمیان ایک سٹاپ پر اتار کر بس واپس چلی گئی۔ میرے لیے اب اس بات میں شک اور شُبے کی گنجائش نہ رہی تھی کہ یہ جگہ میرے لیے واقعی نحس تھی اور میرے شکوک محض واہمہ نہیں تھے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ گھی کے کنستر کو بلا ٹلنے کے سلسلے کا صدقہ یا قربانی سمجھوں اور لوٹ جاؤں کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی بڑی مشکل یا مصیبت میں پھنس جاؤں مگر تمھیں پتہ ہے ایک تو ابّا جی بناسپتی گھی نہیں کھاتے تھے۔ دوسرے سوچا کہ اگر موقع ہاتھ آ ہی گیا ہے تو ضرور اس جگہ کے اسرار کو جاننا چاہیے۔"

"یہ تم نے اچھا فیصلہ کیا۔"

"بس سٹاپ سنسان پڑا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب ہری بھری فصلیں تھیں ایک پیدل چلنے کا کھلا سا راستہ تھا میں اس پر چلنے لگا۔ میں بے حد چوکنا تھا۔ کہیں پتا بھی ہلتا تو میں ٹھٹک جاتا۔ طرح طرح کے خدشات دل میں سر

اٹھاتے کہیں کسی کھیت سے نکل کر کوئی ڈاکو یا جانور حملہ نہ کر دے۔ کسی بل سے کوئی زہریلا سانپ نہ نکل آئے کسی باؤلے کتّے کا سامنا نہ ہو جائے۔"

"یار تم گاؤں کے رہنے والے ہو پھر اتنا ڈرے۔"

"ڈر تو میرے اندر ایک مدّت سے چھپا ہوا تھا اس سارے علاقے کے بارے میں۔ ورنہ عام حالات میں مجھے کبھی ڈر نہیں لگا۔"

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

"کوئی ڈیڑھ دو میل چلنے کے بعد چند راہ گیروں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پتہ چلا کہ دیہاتیوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ جن کے پاس گھی کے چند کنستر بھی تھے۔ سیم نالے کے پُل کے قریب جاتا دیکھا گیا ہے۔ سیم نالے کا پل زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے اپنی رفتار بڑھا دی اور لوگوں سے پوچھتا ہوا کوئی تین کوس کا فاصلہ طے کر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا اور ان لوگوں کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گیا جو ابھی گھر پہنچے تھے۔"

"بڑی ہمت کی تم نے —— تمھیں دیکھ کر پریشان تو ہو گئے ہوں گے؟"

"ہاں —— سہ پہر کا وقت تھا ایک نیم شکستہ مکان کے کھلے دالان میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ قریب ہی سامان رکھا تھا۔ میرا ٹین بھی وہاں پڑا تھا بڑی عمر کی ایک صحت مند عورت پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ درمیانی عمر کی دو عورتیں اور تین مرد قریب ہی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک آدمی چولھے کے پاس بیٹھا حقّے کی چلم تازہ کر رہا تھا اور سانولے رنگ کی ایک نوجوان لڑکی سب کو باری باری لسّی پلا رہی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا میں سیدھا اندر چلا گیا وہ مجھے دیکھ کر چونکے اور پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔"

"ان کے تو گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ تم وہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"ہاں —— بڑے حیران ہوئے۔ چارپائیوں پر بیٹھے مردوں میں سے ایک جو نسبتاً زیادہ عمر کا تھا اٹھ کر آگے آیا اور بولا۔ آؤ بابو جی اندر آ جاؤ۔"

" اندر تو تم آ ہی چکے تھے پھر۔"

" بڑی عمر کی عورت بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور بغیر کچھ کہے سنے میرے گھی کے کنستر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔ بس چلی گئی تو ہمیں پتہ چلا یہ ہمارا ٹین نہیں ہے۔"

" پھر تم نے کیا کہا؟"

" میں کیا کہتا مجھے پیاس لگی تھی۔ تھکا ہوا بھی تھا۔ انھوں نے بیٹھنے کو کہا میں بیٹھ گیا پھر پہلے انھوں نے دودھ کی لسی پلائی پھر میرے منع کرنے کے باوجود چائے بنانے لگے۔ بار بار کہتے کہ مجھے جو تکلیف ہوئی ہے اس کا انھیں افسوس ہے اور انھوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔"

" اور تم نے یقین کر لیا؟"

" ہاں مجھے یقین ہو گیا کہ غلطی سے ایسا ہوا تھا ورنہ وہ لوگ ایسے نہیں تھے۔ وہ مجھ سے جلد ہی گھل مل گئے اور آپس میں تفصیلی تعارف ہوا۔ بڑی عمر کی عورت نے مجھے بتایا کہ وہ گھی کے کنستر اپنی بیٹی کی شادی کے لیے دوسرے کسی گاؤں سے خرید کر لائے تھے۔ اگلے چاند کی تیرہ تاریخ کو ان کے ہاں بارات آنے والی تھی۔ ان کا اصرار تھا کہ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس شادی میں شامل ہوں۔ میں نے مروتاً وعدہ کر لیا۔ لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پھر ان کا ایک آدمی کنستر اٹھا کر مجھے سڑک پر چھوڑنے آیا۔"

" پیدل؟"

" ہاں ادھر کوئی تانگہ وغیرہ نہیں تھا۔ غریب لوگ تھے۔ کوشش کرتے رہے کہ گھوڑا یا سائیکل کہیں سے مانگ لائیں مگر کچھ انتظام نہ ہو سکا۔ بہر حال جب میں سڑک پر آیا۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بس میں بیٹھا تو مجھے اس لڑکی کا خیال آیا جس نے میرے لیے چائے بنائی تھی اور جس کی شادی میں شرکت کا میں نے اوپر سے دل سے وعدہ کیا تھا۔"

" کوئی خاص بات تھی اس میں ؟ "

" ہاں —— یوں تو گاؤں کی ایک عام سی معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی اس کے مقابلے میں اس کی بھاوجیں زیادہ خوب صورت اور صحت مند تھیں مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں اسے پہلے سے جانتا ہوں اور اسے کہیں دیکھ رکھا ہے۔ اگرچہ اس نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی اور نہ ہی میری طرف غیر معمولی طریقے سے متوجہ ہوئی تھی مگر پھر بھی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اپنائیت موجود تھی بالکل ایسی جیسی کسی پرانے جاننے والے یا قریبی رشتہ دار کی آنکھوں میں ہو سکتی ہے ۔"

" تمھاری کسی سابقہ محبوبہ سے شکل ملتی ہوگی ؟ "

" نہیں یار یہ مذاق کی بات نہیں ۔ اُسے دیکھ کر کوئی ایسا ویسا خیال میرے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ بس مجھے وہ اچھی لگی اور کچھ پُراسرار سی بھی۔ اور گیارھویں اور بارھویں میل کے درمیان پیش آنے والے مختلف واقعات کی روشنی میں میں یہ فیصلہ کرنے میں شاید حق بجانب تھا کہ میری دیرینہ الجھن کا اس لڑکی سے ضرور کوئی تعلق تھا۔ چناں چہ میں نے گھر پہنچتے پہنچتے طے کر لیا کہ اس کے بیاہ پر ضرور آؤں گا اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا ۔"

" پھر تم گئے شادی پر ؟ "

" نہیں —— میرا ارادہ ضرور تھا کہ میں فرزانہ کو بھی ساتھ لے چلوں مگر اتفاق ایسا ہوا کہ جس روز شادی تھی اسے گردے کا درد ہو گیا اور ننھا پہلے ہی بخار میں مبتلا تھا۔ تمھاری بھابی نے اس لڑکی کے لیے جوڑا بھی بنایا ہوا تھا اور چھوٹی موٹی کچھ دوسری چیزیں بھی خریدی ہوئی تھیں ۔ کہنے لگی کہ آپ چلے جائیں مگر میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا ۔ ہم اسی بحث و تکرار میں تھے کہ اباجی نے سن لیا اور کہنے لگے کہ میں چلا جاتا ہوں اور یہ چیزیں پہنچا آتا ہوں ۔"

"اور تم نے جانے دیا؟"

"ہاں وہ کہتے تھے کہ انھیں گاؤں کی شادی دیکھے بڑا عرصہ ہوگیا ہے اس بہانے گھوم پھر آئیں گے۔"

"پھر۔"

"ہم نے انھیں نام پتہ بتایا اور وہ چلے گئے خیال تھا شام کو لوٹ آئیں گے، مگر ان لوگوں نے انھیں روک لیا۔ بڑی خاطر تواضع کی اور میرے، بیوی بچّوں کے لیے تحفے تحائف بھی بھجوائے۔ اباجی دیر تک وہاں کی تفصیلات بتاتے رہے پھر مجھے الگ بلا کر انھوں نے مجھے اس لڑکی کے بارے میں جس کا بیاہ ہوا تھا، ایک عجیب بات بتائی۔"

"اچھا۔ وہ اس سے مل کر آئے تھے؟"

"ہاں —— کہنے لگے کہ جب تمھاری والدہ کا انتقال ہوا تھا اس وقت تم تین سال کے تھے اور ان کی یہی عمر تھی جو اس لڑکی کی ہے اور یہی ناک نقشہ اور قد بُت بال برابر بھی فرق نہیں۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں کیا کہتا۔ مجھے تو وہ لڑکی پہلے ہی پُراسرار معلوم ہوتی تھی۔ اباجی نے مجھے ایک نئی الجھن میں ڈال دیا جس کا حل کسی کے پاس نہ تھا۔"

"پھر تم ملے اس سے کبھی۔"

"میں نے دو تین بار کوشش کی مگر ملاقات نہ ہوسکی پھر جب اباجی کے انتقال کی خبر کہیں سے ان لوگوں تک پہنچی تو وہ چالیسویں پر آئے۔"

"وہ بھی آئی تھی؟"

"ہاں اس کا میاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ لوگ چلے گئے مگر میں نے انھیں تصویر بنانے پر رضامند کرلیا۔"

"تصویر؟"

" ہاں فوٹوگراف : جو سارے جھگڑے کی بنیاد بنا۔"

" مگر تم نے تصویر کیا کرنا تھی ؟"

" تم جانتے ہو یار ـــــــ میں بچپن سے ایک بڑی محرومی کا شکار ہوں جب میری والدہ کا انتقال ہوا میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے اگر کوئی بتاتا کہ فلاں عورت کی شکل تمھاری والدہ سے ذرا سی بھی ملتی ہے تو میرے دل میں اس عورت کے لیے محبت اور احترام پیدا ہو جاتا۔ اس کی صورت تو بقول ابّا جان کے ہو بہو وہی تھی۔"

" اچھا تو تم نے بنالی ؟"

" ہاں اور اسے بڑا کر کے فریم میں لگوا لیا۔ کچھ دن تو فرزانہ خاموش رہی پھر اس نے تصویر غائب کر دی۔"

" ٹھیک کیا انھوں نے آخر بیوی ہیں کیسے برداشت کرلیتیں کہ ایک غیر اور جوان عورت کی تصویر گھر میں ہو ؟"

" یار حد کرتے ہو تم بھی اس کی طرف داری کرنے لگے وہ غیر عورت کی نہیں میری مرحومہ ماں۔"

" تم سے دس بارہ سال چھوٹی تو ہوگی۔"

" ہاں چھوٹی تو ہے۔"

" پھر تم اسے ماں کیسے سمجھ سکتے ہو۔"

" کیوں نہیں سمجھ سکتا۔ میں اگر سو سال کا بھی ہو جاؤں وہ نوجواں ہی رہیں گی، انھوں نے بڑھاپا تو دیکھا ہی نہیں تھا۔"

" یار کیوں مجھے کنفیوز کرتے ہو۔ تصویر بہر حال ان کی تو نہیں نا۔"

" مگر میں نے تو اپنی ماں کی سمجھ کر رکھی ہے۔"

" کیا بچپنا ہے یار ـــــ اتنی سی بات پر تم نے بھابی کو خفا کر کے میکے جانے دیا۔ اور تم اس قدر مدر فکسیشن کا شکار کیوں ہو رہے ہو۔"

"خدا کے لیے تم —— اب ایڈی پس کمپلیکس پر لیکچر شروع نہ کر دینا۔"

"اچھا ذرا —— زیارت تو کراؤ خاتون کی؟"

"یہ دیکھو —— اور خود ہی فیصلہ کرو کیا اسے دیکھ کر کوئی بُرا خیال آ سکتا ہے دل میں۔"

"بھئی کمال ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"یار اسے تو میں جانتا ہوں۔"

"کیسے؟"

"یار ایسا لگتا ہے جیسے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے۔"

"چالیسویں پر تم یہاں تھے نہیں۔ پھر کہاں دیکھا ہو گا۔"

"ٹھہرو مجھے یاد کرنے دو۔"

"کر لو۔"

"یار میرا خیال ہے بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ پہلی بار دیکھو تو بھی لگتا ہے جیسے ہمیشہ سے جانی پہچانی ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"اور بعض عورتوں میں ماں پن اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ہر کسی کو ماں معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے تو خود یہی لگ رہا ہے۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں لاؤ مجھے ٹیلی فون دو۔ میں بھابی سے بات کرتا ہوں۔"

"اس سے تو تم بات کرو —— مگر میں تمھاری اپروچ سے مطمئن نہیں ہوں۔"

اگلی صف کا آدمی

ہمیں پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ اوپر سے ہر ٹریفک سگنل راستہ روک لیتا۔
چھوٹا کہنے لگا " جب پہلا سگنل بند ملے تو پھر سارے سگنل بند ہی ہوتے ہیں۔"

" یہ ضروری تو نہیں ہے۔" میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر کہا " مگر آج ایسا ہی لگ رہا ہے۔"

" کہیں ہم گاڑی سے رہ نہ جائیں ؟" وہ بولی۔

" گاڑی کی فکر نہ کریں جی" ڈرائیور نہایت اطمینان سے سگریٹ سلگا کر کہنے لگا " گھنٹوں کے حساب سے لیٹ ہوتی ہیں۔"

" اور اگر آج گاڑی وقت پر آ گئی تو ؟"

" ابھی کافی وقت ہے۔" ڈرائیور نے کہا " آپ اطمینان رکھیں۔"

" ہم نے اطمینان کا سانس لینا چاہا مگر اگلے چوک پر پھر رکنا پڑا کیوں کہ سگنل بند تھا۔

یہاں گاڑیوں کی اتنی لمبی قطار لگی ہوئی تھی کہ اگر ٹریفک سگنل کھلا بھی ملتا تب بھی ہم بتی سرخ ہو جانے سے پہلے اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے اور جب تک بتی سرخ سے سبز ہوئی ہمارے دائیں بائیں آگے پیچھے چھوٹی بڑی گاڑیوں، بسوں،

رکشاؤں، ریڑھیوں اور ٹرکوں کی قطاریں لگ گئیں۔ ٹریفک سگنل یہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ مگر اس کی بتیاں نظر آرہی تھیں جو باری باری سرخ اور ہری ہوتی رہیں مگر ٹریفک حرکت نہیں کر رہا تھا۔ سبھی لوگ اپنی اپنی جگہ بے چین تھے۔ ہارن بج رہے تھے۔ انجن چل رہے تھے مگر سب اپنی اپنی جگہ رُکے کھڑے تھے۔

ہم بار بار گھڑیاں دیکھتے اور پریشان ہوتے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ مگر کوئی گاڑی آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ ادھر گاڑیوں کی دوہری تہری قطاروں کے درمیان خالی جگہوں پر موٹر سائیکل اور سکوٹر سوار گھسے چلے آتے تھے۔

ڈرائیور نے سر باہر نکالا اور دائیں جانب والے ٹرک ڈرائیور سے جو نسبتاً آسانی سے چوک کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ پوچھا مگر اسے خود اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ٹریفک جام ہونے کی کیا وجہ ہے۔ پھر وہ بائیں جانب والی بس کے ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔

" استاد کیا گڑبڑ ہے؟"

" چوک میں شاید کوئی گاڑی خراب ہوگئی یا الٹ گئی ہے۔"

" اف خدایا" وہ بولی " اب کیا ہوگا؟"

" وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" چھوٹے نے خوش دلی سے جواب دیا۔

" کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے بی بی جی۔" ڈرائیور نے کہا۔ " گھبرانے کی ضرورت نہیں ابھی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

" چوک میں شاید کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔" ہمارے پیچھے والے ریڑھا مزدور نے تیز دھوپ میں کھڑے کھڑے اپنے کسی ساتھی کو بتایا۔

حادثے کا نام سن کر چھوٹا بولا " پھر تو بڑی دیر ہو جائے گی۔"

" حادثہ نہیں جی" ڈرائیور بولا " رش کا وقت ہے۔ یہاں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔

اسی لمحے چوک کی طرف سے دو آدمی گاڑیوں کے درمیان میں سے راستہ تلاش

کرتے ہوئے آئے ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے ایک کہنے لگا۔

"انجن بند کر کے مزے سے آرام کریں استاد۔"

"ہاں بے شک کچھ دیر سولیں۔" دوسرا بولا۔

"کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے؟"

نہیں استاد ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ضد میں گاڑیاں پھنس گئی ہیں۔"

ہم اور زیادہ پریشان ہو گئے۔ ظاہر تھا کہ وہاں سے جلدی نکلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہمیشہ یہ مسئلہ رہتا ہے کہ وہ معمولی سی بات پر نروس ہو جاتی ہے اور انتظار کے لمحوں میں تو بہت ہی بے چین اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی۔

"کوئی بات نہیں اگر ایک گاڑی چھوٹ گئی تو ہم دوسری ٹرین سے چلے جائیں گے۔"

"دوسری ٹرین سے؟"

"ہاں کیا ہوا —— جہاں رات گیارہ بجے پہنچنا ہے وہاں دو گھنٹے لیٹ پہنچ جائیں گے۔"

"یعنی کل کی تاریخ میں؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق نہیں پڑتا —— آپ کو تو پتہ ہے۔ ہمارا آج کی تاریخ میں پہنچنا کتنا ضروری ہے۔"

"ان سب لوگوں کو جو یہاں رُکے کھڑے ہیں کہیں نہ کہیں جلدی اور ضروری پہنچنا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر بڑی مشکل پڑ جائے گی۔"

"پھر کیا کیا جائے۔"

"کیوں نہ اتر کر پیدل چلیں۔" چھوٹا کہنے لگا "چوک سے آگے دوسری ٹیکسی لے لیں گے۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے۔" وہ بولی "مگر سامان کا کیا ہوگا۔"

"تھوڑا تھوڑا سب اٹھا لیتے ہیں۔" چھوٹے نے جواب دیا۔

چناں چہ ہم نے ایسا ہی کیا ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے اور ڈرائیور سے معذرت کرتے ہوئے ہم سامان اٹھا کر چل دیئے۔ مگر آگے پیدل جانے کا راستہ بھی مسدود ہو چکا تھا۔ ناچار ہم پچھلے چوک کی طرف روانہ ہوئے ہم نے پروگرام بنایا کہ پچھلے چوک سے ایک دوسرے راستے سے ہوتے ہوئے اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کریں۔

اتفاق سے ہمیں دوسری ٹیکسی آسانی سے مل گئی اور ہم متبادل راستے پر چل پڑے۔ مگر تھوڑی دور جانے کے بعد پتہ چلا کہ یہ سڑک بھی ٹریفک رکنے سے بند ہو چکی ہے مگر ہم نے ہمت نہ ہاری اور نہ ہی ٹیکسی کے بڑھتے ہوئے کرایہ کی پروا کی اور ایک تیسرے راستے سے جو خاصا طویل تھا۔ اسٹیشن کا رُخ کیا۔ مگر بدقسمتی سے ہم اس میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ ٹریفک منجمد ہونے کے اثرات یہاں تک پھیل چکے تھے چناں چہ ہم واپس اس مقام پر آ گئے جہاں سے ٹریفک کھلنے کی صورت میں فاصلہ کم پڑتا تھا اور جہاں سے ہم نے دوسری ٹیکسی لی تھی۔ مگر اب یہاں بھی ٹریفک کا دباؤ تھا اور ہر لمحے گاڑیوں کی لمبی قطاریں مزید لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔ اب ہماری پہلی ٹرین یقیناً نکل چکی تھی۔ شاید ہم دوسری گاڑی پکڑ سکیں اس امید کے ساتھ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر ٹریفک کے حرکت میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔

"اس سے بہتر ہے کہ ہم رات کو دیر سے پہنچیں۔" وہ بولی "سفر ہی ملتوی کر دیا جائے۔"

"اب تو واپسی کا راستہ بھی بند ہو چکا ہے۔" ڈرائیور نے اطلاع دی۔

"تو کیا، ہم واپس گھر بھی نہیں جا سکتے۔" چھوٹا بولا۔

"بہت مشکل ہے برخوردار" ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا۔

"مجھے تو لگتا ہے ہم دوسری گاڑی بھی نہیں پکڑ سکیں گے۔"

"ہاں کچھ ایسے ہی حالات ہیں۔ ممکن ہے ہمیں آخری گاڑی سے جانا پڑے۔"

"اوہ میرے خدا" وہ اور پریشان ہو گئی۔ "یہ تو بہت تکلیف دہ بات ہے۔"

اب صورت حال یہ تھی کہ تمام شہر کا ٹریفک منجمد تھا اور ہر سڑک اور بازار میں ہر لمحے گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور جس طرح دریا بہتا رہے تو وہ دریا رہتا ہے رک جائے تو جھیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور سیلاب بن کر سب کچھ ڈبو دیتا ہے۔ اسی طرح ٹریفک چلتا رہتا ہے تو پتہ نہیں چلتا کہ کتنی سیکڑوں گاڑیاں گزر گئیں۔ مگر جب ایک پل کے لیے بھی رک جائے تو پھر کئی طرح کی دوسری خرابیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں ہر کوئی جھنجھلایا ہوتا ہے اور ایک دوسرے میں گھسا چلا آتا ہے۔ بعض گاڑیوں کے انجن بند ہو جائیں تو دوبارہ اسٹارٹ نہیں ہوتے۔ اگر ٹریفک کھل جائے تو بھی ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی وجہ سے کنفیوژن اور الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں تو ٹریفک کے حرکت میں آنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔ بعض ڈرائیوروں نے سڑک کے بیچ جہاں وہ تھیں گاڑیاں بند کر دی تھیں اور خود کسی دوسرے ڈرائیور یا جاننے والے سے گپ شپ لڑانے چلے گئے تھے۔ بعض نے قریبی چائے خانوں کا رُخ کیا تھا۔ خود ہمارا ٹیکسی ڈرائیور فرصت پا کر شیو بنوا آیا تھا۔ آج گرمی بھی اپنے عروج پر تھی۔ بسوں، ویگنوں، سوزوکیوں اور کاروں میں ٹھنسے ہوئے لوگوں کا مارے گرمی، حبس اور پیاس کے برا حال ہو رہا تھا۔ دھوئیں اور ڈیزل کی بدبو نے فضا کو اور بھی مکدر کر دیا تھا۔ انجنوں اور ہارنوں کے شور سے کان پھٹے رہے تھے۔ ٹریفک پولیس کے سپاہی جگہ جگہ بے نتیجہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ مجھے ان مزدوروں کا خیال آ رہا تھا۔ جن کی دیہاڑی ماری گئی تھی اور ان مریضوں کا جو ہسپتال نہیں پہنچ سکے تھے۔ وہ بار بار تھرموس سے پانی پی رہی تھی مگر چھوٹا تھک کر اب اونگھ رہا تھا۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ اگر اس وقت ہوائی جہاز سے شہر کا نظارہ کیا جائے تو کیسا خوفناک منظر دکھائی دے۔ ایسا معلوم ہو جیسے سارا شہر ساکت و جامد ہو گیا ہے۔

ہم نے ایک ریڑھی والے سے پھل خریدا پھر ڈرائیور سے کہہ کر قریبی ریستوران سے چائے منگائی۔ مگر تھکاوٹ اور بوریت کم نہ ہوئی البتہ جس طرح رنج سے خوگر ہونے سے رنج کا احساس مٹ جاتا ہے اس طرح وہ مسلسل مضطرب رہنے کے بعد اب قدرے پرسکون ہوگئی تھی۔ اس دوران ہم نے کئی بار سامان اٹھا کر پیدل گھر واپس جانے کا ارادہ کیا مگر ایک تو فاصلہ بہت تھا۔ دوسرے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ٹریفک میں ہل چل پیدا ہو جاتی اور امید بندھ جاتی کہ شاید اب ٹریفک رواں ہونے والا ہے۔

پھر ہمارے قریب کھڑی منی بس کے ڈرائیور کا کوئی جاننے والا بڑے چوک کی طرف سے پیدل چلتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ سڑک جلد ہی صاف ہو جائے گی اور ٹریفک حرکت میں آجائے گی۔

"چکر کیا تھا بھائی؟"

"کوئی خاص بات نہیں تھی استاد ——— بس ایک شخص نے ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے زبردستی اپنی گاڑی آگے بڑھادی دوسری طرف سے گاڑیاں پہلے ہی آگے بڑھ چکی تھیں۔ اسے ریورس کرنے کو کہا گیا مگر اس نے ایک نہ سنی اور جب تک ٹریفک پولیس مداخلت کرتی ریورس کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ کیوں کہ ہر طرف گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ چکی تھیں۔

"کمال ہے۔" وہ بڑبڑائی "صرف ایک شخص کی وجہ سے سارے شہر کا ٹریفک جام ہوگیا۔"

"ہر واقعہ کا محرک کوئی ایک شخص ہی ہوتا ہے۔ وہ آگے ہوتا ہے یا اگلی صف میں ہوتا ہے۔ اسی سے پہل ہوتی ہے۔"

"ایسے شخص کو سخت سزا ملنی چاہیے جو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتا ہے۔"

"ابو" چھوٹا پچھلی سیٹ پر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور بولا "ہم تو وہیں ہیں جہاں صبح تھے۔"

"ہاں بیٹا" وہ بولی "جہاں اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی ہو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے
کوئی بھی کہیں نہیں پہنچ سکتا یا سب کو دیر ہو جاتی ہے۔"

اچانک ٹریفک میں پھر ہل چل پیدا ہو گئی۔ ایک بار پھر انجن سٹارٹ ہو گئے۔ ہارن
بجنے لگے اور ٹریفک پولیس کے سپاہیوں کی وسلیں سنائی دینے لگیں اور ہم آخری ٹرین
پکڑنے کی امید میں ایک بار پھر بیتابی سے ٹریفک کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔

شجر بے سایہ

سہ پہر کا وقت تھا جب نمبردار کی بیوی ست بھرائی اسے اپنے ساتھ لے کر اس کے گھر پہنچانے نکلی۔

وہ میلے میں لٹ جانے اور خالی ہاتھ واپس آنے والے بچّے کی طرح آنکھیں جھکائے کھوئی کھوئی ست بھرائی کے پیچھے چل رہی تھی وہ اسے بار بار تسلیاں دے رہی تھی مگر وہ سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ وہ چہرہ جس پر گلاب مہکتے اور کلیاں چٹکتی تھیں ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے چادر سے سارا بدن منہ اور سر لپیٹ رکھا تھا مگر اسے اپنی عریانی کا احساس مارے ڈال رہا تھا۔ عورتیں اور لڑکے بالے اسے یوں رک رک کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ مداری کے پیچھے چلتی بندریا ہو اور ابھی کسی موڑ پر رک رک کر کرتب دکھانے لگے گی۔

کاش وہ اسے رات کے اندھیرے میں لے کر آتے اس نے دکھ سے سوچا۔ مگر اب سارے فیصلے دوسروں کے ہاتھ میں تھے۔ اپنا فیصلہ غلط ثابت ہو جائے تو آئندہ فیصلوں کا اختیار خود بخود چھن جاتا ہے۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور قدم لڑکھڑا رہے تھے جیسے وہ اپنے گھر نہیں جا رہی پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہی ہو، نمبردار اور گاؤں کے سرکردہ لوگوں نے اس کی برآمدگی کے وقت یقین دلایا تھا کہ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن وہ اپنے

گھر والوں کو جانتی تھی اسے معلوم تھا کہ اگر وہ کسی طرح زندہ بچ بھی گئی تو اس کا جینا موت سے بد تر ہو گا، وہ اس کے ہاتھ پاؤں ضرور توڑ دیں گے اور وہ کئی روز تک زخموں سے چور کراہتی رہے گی۔

ست بھرائی اس کے آگے آگے اس کے گھر میں یوں داخل ہوئی جیسے فاتح فوج کا جرنیل دار السلطنت میں داخل ہوتا ہے مگر وہاں کسی نے ان دونوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ماں صحن میں چارپائی پر بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی وہ اسی طرح چپ چاپ چاول صاف کرتی رہی۔ چھوٹا بھائی لکڑیاں چیر رہا تھا وہ بدستور لکڑیاں چیرتا رہا، بڑا بھائی صحن کے ایک کونے میں چارپائی کی ادوائن ٹھیک کر رہا تھا۔ وہ بھی اپنے کام میں لگا رہا۔ صرف بھابی نے اس پر ایک نظر ڈالی مگر ایسی جیسی گھر میں گھس آنے والے پلّے پر ڈالتے ہیں۔ البتہ اس نے ست بھرائی کو بیٹھنے کے لیے سرکنڈوں سے بنا ہوا مونڈھا لا کر دیا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ ست بھرائی خود ہی باری باری سب کو مشورے دیتی اور نصیحتیں کرتی رہی کہ انسان خطا کا پتلا ہے اس عمر میں ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کا درجہ بلند کرتا ہے وغیرہ۔

وہ سیدھی پسار میں چلی گئی تھی اور دروازے کے ساتھ لگ کر ایسی جگہ بیٹھ گئی تھی جہاں سے سب کی حرکات و سکنات نظر آ سکیں وہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہنا چاہتی تھی اسے ڈر تھا کہ لکڑیاں چیرتا ہوا بھائی کلہاڑا لے کر اس کی طرف بڑھے گا اور اسے سوکھی لکڑی کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

تھوڑی دیر بعد ست بھرائی جانے لگی تو اس کا دل بیٹھنے لگا اسے لگ رہا تھا اس کے جاتے ہی وہ اندر آ جائیں گے اور وہ ان سے اپنی زندگی کی بھیک بھی نہیں مانگ سکے گی۔ کچھ مانگنے اور بخشوانے کے لیے الفاظ ضروری تھے اور اس کے پاس پچھتاوے کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مگر ست بھرائی کے جانے کے کافی دیر بعد بھی کسی نے اسے برا بھلا کہا نہ کوئی ڈنڈا چھانٹا لے کر

اندر آیا تو اسے ہول سا آنے لگا۔ شاید اس کا جرم ایسا تھا کہ کسی چھوٹی موٹی سزا سے اس کی تلافی ممکن نہ تھی۔

شام ہونے کو تھی ورِیامو کلہاڑا ایک طرف پھینک کر دودھ دوہنے چلا گیا۔ بڑا بھائی گا موحقّہ تازہ کرنے لگا بھابی ننھی صغریٰ کو گود میں لے کر چولھے کے پاس بیٹھ کر چاول پکانے لگی اور ماں رسی پر دھو کر لٹکائے ہوئے کپڑے جمع کرنے لگی۔ کپڑے جمع کر کے وہ اندر آئی اور اس کے قریب سے یوں گزر گئی جیسے وہ اسے دکھائی نہ دے رہی ہو۔ ماں نے کھونٹی سے لالٹین اتاری اور اسے جلا کر دروازے کی چوکھٹ سے لٹکا دیا اسے لالٹین کی روشنی بری لگی جیسے اس نے اسے اور زیادہ عریاں کر دیا ہو۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ مکھی بن کر کسی ٹرنک کے پیچھے جا چھپتی، چیونٹی بن کر کسی سوراخ میں گھس جاتی۔

چھوٹا بھائی دودھ کا برتن سر پر اٹھائے آ پہنچا تو دونوں بھائی چولھے کے پاس بیٹھ کر کنالیوں میں چاول کھانے لگے۔ ماں ننھی صغریٰ کو ٹہل ٹہل کر اور تھپک تھپک کر بہلانے لگی۔

اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا کھانے پینے کا اسے ہوش ہی کب تھا۔ ست بھرائی نے اسے اپنے گھر میں روٹی دی تھی مگر نوالہ اس کے حلق سے نہ اترتا تھا۔ وہ خالی پیٹ اتنی دور سے پیدل چل کر آئی تھی مگر اب بھی اسے کھانے کی خواہش محسوس نہیں ہو رہی تھی پھر بھی اگر کھانا کھاتے ہوئے بھائیوں میں سے کوئی اس کے بارے میں پوچھ لیتا کہ اس نے کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں تو وہ بغیر کھائے پیئے جی اٹھتی۔ مگر انھوں نے تو شاید ہمیشہ کے لیے اسے کنبے سے خارج کر دیا تھا۔ مگر بھابی کو بالآخر اس کا خیال آ ہی گیا اس نے تھالی میں چاول ڈالے اور اندر آ کر تھالی اس کے آگے سرکا دی اور کچھ کہے سنے بغیر لوٹ گئی۔ اسے لگا جیسے سچ مچ وہ ایک پالتو کتیا ہو جسے راتب ڈالا گیا ہو۔ وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی تھی اس نے بہت کوشش کی مگر اس سے سسکیاں

روکی نہ جا سکیں۔ اس کی سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز سن کر بھی کسی کا نوالہ رُکا نہ ہی کسی نے اس کا برا منایا۔ وہ رو دھو کر خود ہی چپ ہو گئی اس نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے چند ایک لقمے بھی زہر مار کیے۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔ بھابی پانی دے کر نہیں گئی تھی اور اسے باہر جا کر نلکے یا گھڑے سے پانی لینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

باہر کا دروازہ عموماً کھلا رہتا تھا مگر آج اسے بند کر دیا گیا تھا۔ بند دروازہ دیکھ کر اسے اپنا سانس رُکتا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہوا کا راستہ روک دیا گیا ہو۔ دو ایک بار کسی نے دستک دی تو اس کی ماں دروازے تک گئی اور ہر بار بڑبڑاتی ہوئی دروازہ کھولے بغیر واپس آ گئی۔ ضرور گاؤں کی عورتیں آنا چاہتی ہوں گی جن کو بُرا بھلا کہہ کر ماں نے وہیں سے لوٹا دیا ہوگا۔ اس کے گھر والے پہلے بھی کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے اور اب تو وہ اور بھی بپھرے ہوئے تھے۔

کھانا کھا کر دونوں بھائی صحن میں بیٹھ کر کچھ دیر حقّہ پیتے رہے وریامو باڑے میں جا کر سوتا تھا مگر آج وہ گھر پر ہی رہا۔ گامو بھی خلاف معمول جلدی اُٹھ کر سونے کے لیے چلا گیا جیسے انھیں جلدی جاگنا اور کسی اہم مہم پر جانا ہو اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔

کچھ دیر بعد بھابی صحن میں۔ برتن۔ بھانڈے۔ جمع اور صاف کرتی رہی پھر ننھی صغریٰ کو لے کر وہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماں برآمدے میں بیٹھ کر تازہ پسا ہوا آٹا مٹکی میں ڈالنے لگی۔ ماں نے کھانا نہیں کھایا تھا اس نے کھانا کیوں نہیں کھایا تھا یہ سوچ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا کہ کہیں گھر میں کچھ ہونے والا تو نہیں تھا۔

لالٹین بجھا کر ماں پسار میں آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی تو اس نے کچھ دیر تامل کیا پھر ہمت کر کے اٹھی اور اس کی پائنتی پر بیٹھ گئی وہ اس کے

پاؤں پر سر رکھ کر رونا چاہتی تھی مگر ماں نے پاؤں سمیٹ لیے اور کروٹ بدل لی وہ چپ چاپ سانس روکے اسی جگہ بیٹھی رہی۔ ماں جاگ رہی تھی مگر خود کو سویا ہوا ظاہر کر رہی تھی وہ کئی راتوں کی جاگی اور دن بھر کی تھکی ہوئی تھی اسے پائنتی پر بیٹھے بیٹھے نیند آنے لگی مگر اسے اپنی چارپائی پر اکیلے سونے سے ڈر لگ رہا تھا پتہ نہیں کب چھوٹا یا بڑا یا وہ دونوں بھائی چپکے سے اندر آجائیں اور اسے چلنے کو کہیں ۔۔۔ وہ چیخنا چاہے گی مگر اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکے گا۔ پھر پتہ نہیں وہ اسے کہاں لے جائیں۔ کس طرح ہلاک کریں۔ ہو سکتا ہے گلا گھونٹ دیں ۔۔۔ چھری یا نوکے سے ذبح کر کے زمین میں دبا دیں۔ کنویں یا نہر میں دھکا دے دیں۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ اسے لینے آئیں گے تو ماں اسی طرح خاموشی سے خود کو سویا ہوا ظاہر کرے گی وہ اس کی اتنی بڑی خطا کیسے معاف کر سکتی تھی۔ معاف کرنا یا درگزر کرنا اس گھر کے لوگوں نے سیکھا ہی نہیں تھا اور پھر وہ اپنے بیٹوں سے بہت ڈرتی تھی وہ بگڑ جاتے تھے تو ماں کو بھی لہو لہان اور بے عزت کر دیتے تھے گھر میں صرف ایک بھابی تھی جو اس کی جان بچا سکتی تھی مگر وہ کیوں بچاتی۔ اس نے بھابی کے کبڑے بھائی کا رشتہ ٹھکرا کر اسے ہمیشہ کے لیے اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ ویسے بھی وہ قصے کہانیوں کی روایتی بھابی کی طرح اس سے جلتی اور شاید اس کے خون سے سالو رنگنے کی خواہش رکھتی تھی۔

وہ ماں کی پائنتی پر بیٹھی زار و قطار روتی رہی۔ اس کی ماں ضد کی پکّی اور دل کی سخت ضرور تھی مگر کبھی کبھی وہ مہربان بھی ہو جاتی تھی یا کم از کم تھوڑی دیر کے لیے نرم پڑ جاتی تھی مگر آج اس کا دل پگھل ہی نہیں رہا تھا۔ پھر پتہ نہیں کب اور کیسے وہ روتے روتے وہیں پائنتی پر گچھا مچھا سی ہو کر سو گئی مگر ڈراؤنے خواب دیکھ دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی سونے اور جاگنے میں اسے کچھ فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ خوابوں نے بھی اسے پناہ دینا چھوڑ دیا تھا۔

اگلے روز اس نے بھائیوں کی نظر سے اوجھل رہ کر گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنا شروع کر دیئے۔ برتن اور کپڑے دھوتی، چارپائیاں اور بستر بچھاتی۔ جھاڑو دیتی اور ننھی صغریٰ کو بہلاتی مگر بھابی نے اسے کھانے پینے کی چیزوں کو چھونے سے منع کر دیا تھا۔ تیسرے، چوتھے روز اس نے کھانا کھاتے ہوئے بڑے بھائی کے پاس ڈرتے ڈرتے پانی کا گلاس لاکر رکھ دیا تو اس نے گلاس اٹھا کر دیوار پر دے مارا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا پھر کھانا چھوڑ کر پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا اس کے بعد وہ پھر سے سہم گئی اور اسے طرح طرح کے اندیشوں نے گھیر لیا۔

وہ گھر میں رہتی تھی مگر گھر کا کوئی فرد اس سے بات نہ کرتا تھا اس نے ماں سے کئی مرتبہ بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر ماں جواب نہیں دیتی تھی۔ سوائے ننھی صغریٰ کی ہوں ہاں کے وہ بات کرنے کو ترس گئی تھی۔ ایک رات اس نے ماں کے پاؤں پکڑ لیے اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

"ماں مجھے مار مجھ پر تھوک۔ مجھے گالیاں اور طعنے دے خدا کے لیے کچھ تو کہہ۔"

"میں تیری ماں نہیں ہوں تو کسی کتیا کی اولاد ہے۔"

ماں نے گالی دی تو ناامیدی کے اندھیرے میں امید کا چمکتا ہوا جگنو دکھائی دیا۔۔۔۔۔ مگر دوسرے ہی لمحے ماں نے ایک ایسی بات کہہ دی جسے سن کر وہ سناٹے میں آ گئی۔

"تو اس گھر میں مہمان ہے پتہ نہیں کتنے دن کتنی گھڑیاں۔"

"نہیں ماں۔۔۔۔۔ خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔"

"اپنی ناپاک زبان سے خدا رسول کا نام مت لے۔"

"میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں ماں۔"

"کچھ فائدہ نہیں۔"

" تو کیا سچ مچ ماں ؟ "

" ہاں ۔"

" کب ؟ "

" یہ مجھے نہیں پتہ ۔"

مارے خوف کے اس کا حلق خشک ہو گیا، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

(۲)

گاؤں سے قصبے کو جانے والی کچی سڑک پر ایک حویلی تھی جسے کتوں والی حویلی کہا جاتا تھا۔ دو خونخوار قسم کے بولی کتے دن رات حویلی کے ارد گرد گھومتے رہتے تھے ان کے مالکوں کا جب جی چاہتا کھلا چھوڑ دیتے تھے۔ ان کتوں کے ڈر سے لوگوں نے کچّی سڑک سے گزرنا چھوڑ دیا تھا اور انھیں قصبے میں آنے جانے کے لیے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ کوئی اجنبی یا بھولا بھٹکا شخص ادھر آ نکلتا تھا تو اسے کتوں سے جان بچانا مشکل ہو جاتی تھی۔ ان کتوں نے کئی لوگوں کو زخمی کیا اور بھنبھوڑا تھا گاؤں والے احتجاج کر چکے تھے کئی وفد بھیج چکے تھے مگر ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ گاؤں کے لڑکے، جو قصبے کے اسکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ نہایت بچ بچا کر اور لمبا چکر کاٹ کر وہاں سے گزرتے تھے انھوں نے ان کتوں کے نام بھی گامو اور وریامو رکھ دیتے تھے۔

گامو اور وریامو کو لوگ نہایت اجڈ اور ظالم سمجھتے تھے جنھوں نے اپنی سگی بہن کو قتل کر کے نہر یا دریا میں بہا دیا یا گڑھا کھود کر کسی کھیت میں دبا دیا تھا اور گاؤں والوں سے ہر قسم کا تعلق توڑ کر اور گاؤں کی سکونت ترک کر کے یہاں سب سے الگ اس حویلی میں رہنے لگے تھے۔

یہ حویلی کسی زمانے میں مویشیوں کا باڑا تھی وہاں ایک کنواں بھی تھا جسے

اب پر کر دیا گیا تھا۔ غفوراں کے روپوش یا قتل ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے اس میں چند ایک کمروں کا اضافہ کر کے اسے حویلی کی شکل دے دی تھی۔
گاؤں میں اس حویلی کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔
باغ علی حجام کا کہنا تھا کہ ایک دوپہر کو وہ قصبے کی مشین سے آٹا پسوا کر لوٹ رہا تھا کہ حویلی سے کچھ فاصلے پر کسی عورت نے اس کا نام لے کر پکارا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔
دوسرے جیسے اعتباری آدمی کا بیان تھا کہ اس نے ایک رات کھیتوں کو پانی لگایا ہوا تھا کہ اس نے دیکھا ایک جواں سال عورت بال بکھرائے کھال کے اندر بے آواز چلتی جا رہی تھی اس نے آواز دی تو قہقہہ لگا کر غائب ہو گئی۔ حویلی سے کچھ فاصلے پر ایک بہت اونچا کھجور کا پیڑ تھا بعض لوگوں نے کھجور کے اس پیڑ کے قریب سے بھی عجیب و غریب قسم کی آوازیں سنی تھیں۔ دتو میراثی نے ایک پچھل پیری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی تھا۔
ایک روز چودھری سرور کی بیٹی باپ کا کھانا لے کر کھیتوں میں گئی۔ چودھری سرور آم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا اور وہ قریب بیٹھ کر پنکھا جھل رہی تھی کہ اچانک اسے پتہ نہیں کیا سوجھی وہ دوڑ کر درخت پر چڑھ گئی۔ چودھری سرور نے خفا ہو کر ڈانٹا کہ جوان لڑکیاں درختوں پر نہیں چڑھتیں تو وہ جواب میں قہقہے لگاتی اور اوپر چڑھتی جاتی۔ پھر اس نے آم کی ٹیسی سے چھلانگ لگا دی اور گر کر بے ہوش ہو گئی اب وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتی تھی۔
لوگوں نے ایسے سب واقعات اور قصوں کی کڑیاں حویلی سے ملا دی تھیں اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ غفوراں کو نہایت بے دردی سے قتل کر کے حویلی کے پاس کہیں ان کھیتوں میں دفن کر دیا گیا تھا اور اس کی بے چین روح بھوت یا چڑیل کی صورت میں وہاں گھومتی رہتی تھی۔ گاؤں میں صرف ایک مولوی فیروزدین

تھے۔ جوان باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے اور انھیں ضعیف العقیدہ لوگوں کا واہمہ قرار دیتے تھے لیکن پھر ایک روز ان کے ساتھ نہایت عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ رات کے وقت قصبے سے لوٹ رہے تھے کہ اچانک ان کے آگے آگے ایک دیا روشن ہوگیا۔ کچھ دیر وہ ردبلا کے لیے مخصوص دعائیں اور وظیفے پڑھتے رہے مگر جب جلتا ہوا دیا ان کے بہت قریب آگیا اور ہوا میں تیرتا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تو وہ ساری دعائیں بھول گئے اور بے ہوش ہو کر کھڈ میں گر گئے۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ غفوراں کو قتل کر کے نہر یا دریا میں بہا دیا گیا تھا بعض کا خیال تھا کہ اسے گاؤں والے مکان میں قتل کر کے دفن کر دیا گیا۔ یہ مکان اب تک مقفل تھا۔ وہ اسے فروخت کرتے تھے نہ اس کی دیکھ بھال اور مرمت پر توجہ دیتے تھے۔ مگر ساتھ والے گاؤں کے مستری ظہور نے جو حویلی کی تعمیر اور مرمت کا کام کرتا رہا تھا لوگوں کو بتایا تھا کہ حویلی کے اندر گاموں اور ریاموں کے گھروں کے عین درمیان ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا جس پر سرکنڈوں اور سوکھی ہوئی لکڑیوں کا ڈھیر پڑا رہتا تھا اور جسے گھر کے لوگ ضرورت کے وقت بھی نہیں جلاتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چبوترا دراصل ایک قبر تھی اور اسی کی نگرانی کی خاطر ہی وہ لوگ گاؤں والا مکان چھوڑ کر وہاں منتقل ہوئے تھے۔

گاؤں کی عورتیں بوڑھی سکینہ کو بھی چڑیل کے نام سے ہی یاد کرتی تھیں جو اپنی بیٹی کی حفاظت نہ کر سکی تھی اور ماں ہو کر اسے بدسلوکی سے تنگ آکر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا تھا پھر اس کے عیبوں پر پردہ ڈالنے کی بجائے قتل ہو جانے دیا تھا۔ وہ گاؤں میں بہت کم آتی تھی مگر جب بھی آتی جدھر سے گزرتی سہاگنیں، حاملہ عورتیں اور نوجوان لڑکیاں اس کے سائے سے بچنے کے لیے راستہ بدل لیتیں۔ ان کا خیال تھا وہ جسے چھو لے گی یا جس سے بات کرے گی

اس کی کوکھ کبھی ہری نہ ہوگی یا گود خالی ہو جائے گی۔ اس کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ وہ جس درخت کے نیچے بیٹھ جاتی تھی وہ بے سایہ ہو جاتا تھا۔ گاؤں میں جب بھی کوئی غیر معمولی واقعہ یا حادثہ رونما ہوتا بوڑھی سکینہ اور اس کے خاندان کو اس میں ضرور ملوث کر لیا جاتا۔ بڑی بوڑھیوں نے تو گامو کے ہاں نرینہ اولاد نہ ہونے کو بھی غفوراں کی روح کا انتقام ہی سمجھا تھا اور جب دریامو کا نوعمر بیٹا سانپ کے ڈسنے سے مر گیا تو اسے بھی اسی انتقامی کارروائی کا حصہ سمجھا گیا جو غفوراں اپنے گھر والوں سے لے رہی تھی۔

سکینہ نے بھی کبھی اپنی صفائی میں کچھ کہنا ضروری سمجھا تھا۔ شروع میں جب لوگ استفسار کرتے تھے تو وہ نہایت مختصر سا جواب دے کر آگے بڑھ جاتی تھی۔

"چلی گئی ..... جہاں سے کرماں ماری آئی تھی۔"

بعض لوگوں نے اس سے یہ مطلب نکالا تھا کہ وہ گھر والوں کی بدسلوکی اور خوف کی وجہ سے دوبارہ بھاگ کر موچیوں کے پاس چلی گئی تھی جو اس کے بھائیوں کے خوف سے روپوش ہو گئے تھے مگر بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ بڑھیا نے نہایت پتے کی بات کی تھی انسان مر کر بھی تو وہیں جاتا ہے جہاں سے آیا ہوتا ہے۔

(۳)

گاؤں کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ یہ خاندان پرانے زمانے کے کسی ایسے غیر ملکی حملہ آور قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جو جسمانی خوب صورتی میں لاثانی تھا۔ خصوصاً ان کی عورتیں حسن و جمال میں نہایت ممتاز حیثیت کی حامل ہوتی ہیں۔ چناں چہ جب صغریٰ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو آس پاس کے دیہات میں ایک بار پھر اس خاندان کے حسن کی دھوم مچ گئی۔

اگرچہ صغریٰ بہت کم حویلی سے باہر قدم رکھتی ہے مگر اب حویلی کے گرد

حصار پہلے جیسا ناقابل عبور نہیں رہا۔ وریامو اور گامو کا ایک دوسرے سے جھگڑا ہو گیا ہے اور وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور ایک دوسرے سے بات تک کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ گامو کو نرینہ اولاد نہ ہونے کے صدمے نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ سکینہ بوڑھی اور کمزور ہو گئی ہے اور اگرچہ وہ وریامو کے پاس رہتی ہے مگر وہ ماں سے زیادہ صغریٰ کا خیال رکھتی ہے۔ ان کے بولی کتے مر کھپ گئے ہیں ایک بیمار پڑ گیا تھا دوسرے کو کسی نے زہر دے دیا۔ کتے اب بھی حویلی کی رکھوالی کرتے ہیں، مگر وہ بھونک کر چپ ہو جانے یا تھوڑی دور تک پیچھا کر کے ہانپ جانے والے عام سے کتے ہیں۔ ان لوگوں کے گاؤں والوں سے تعلقات بھی بہتر ہو رہے ہیں اور وہ شادی غمی کے موقعوں پر گاؤں میں آنے جانے لگے ہیں۔ صغریٰ اکیلی کہیں نہیں جاتی مگر ماں یا دادی کے ہمراہ کبھی کبھار گاؤں چلی جاتی ہے۔

پچھلے کچھ عرصہ سے حویلی کے گرد منڈلانے والے نوجوانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔ رات کو چاروں طرف سے بانسریوں، الغوزوں اور فراقیہ گیتوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ صغریٰ دن کو بار بار چھت پر آنے جانے اور راتوں کو دیر تک جاگنے لگی ہے۔

یہ سرما کی ایک تاریک اور سرد رات کا قصہ ہے جب آدھی رات کے قریب رابعہ نے اپنے شوہر کو سوتے میں جگا کر بتایا کہ صغریٰ حویلی میں نہیں ہے۔

"کہاں گئی۔" گامو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"میری آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر میں نہیں تھی۔ میں نے پہلے تو یہی جانا کہ اِدھر اُدھر ہو گی ابھی آجائے گی مگر اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔"

"تمھیں اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا میں اس کتیا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" شور سن کر سکینہ بھی جاگ گئی اور لڑکھڑاتی ہوئی آ گئی۔

رابعہ نے لالٹین جلائی ۔ گاموں نے ٹکوا سنبھالا۔ لالٹین لے کر وہ تینوں کچھ دیر حویلی کے اندر باہر اسے ڈھونڈھتے رہے انھوں نے وریامو کے گھر میں بھی جھانکا مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر سکینہ نے مشورہ دیا۔

" تم ترکھانوں کے ہاں جاکر دیکھو ان کا بیٹا فضلو اکثر حویلی کے آس پاس منڈلایا کرتا ہے۔ جلدی کرو۔"

گاموٹکوا لیے، اندھیرے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا گاؤں کی طرف چلا گیا تو رابعہ روتے ہوئے اپنی ساس سے لپٹ گئی۔

" اب کیا ہو گا ماسی ؟"

" وہی جو اس گھر میں ہوتا چلا آیا ہے۔"

" نہیں ماسی۔ خدا کے لیے ایسا نہ کہو ۔۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔"

"میرے کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے میری اس گھر میں کون سنتا ہے۔"

" تم اس کے پیچھے جاؤ ماسی ۔۔۔ وہ اسے مار ڈالے گا۔"

" نہیں یہ غیرت کا معاملہ ہے وہ میری ایک نہیں سنے گا۔"

ابھی پو نہیں پھٹی تھی جب حویلی کے باہر آہٹ سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے دیکھا وہ اسے ساتھ لیے آ پہنچا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اس کے بال الجھے ہوئے تھے معلوم ہوتا تھا اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا ہے وہ ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔

حویلی کا صدر دروازہ بند کر کے گاموں اس کے قریب آیا اور اسے لاتوں اور مکوں سے پیٹنے لگا وہ زمین پر گر گئی تو وہ دھاڑا۔

" ٹوکا کہاں ہے میں اس کے ٹکڑے کر دوں گا۔"

صغریٰ ماں کے پاؤں پڑ گئی۔

" مجھے بچا لو ماں ۔۔۔۔ ابا مجھے مار ڈالے گا۔"

" ٹوکا تمھارے پاس پڑا ہے گاموں" سکینہ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

رابعہ نے غصے اور نفرت سے اور صغریٰ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ گاموٹوکا اٹھانے کے لیے مڑا تو رابعہ نے اسے روک دیا اور بولی۔

"ہوش کرو غصے میں تم پاگل ہو جاتے ہو۔"

پھر اس نے ٹوکا پکڑ کر دور اندھیرے میں پھینک دیا اور زمین پر گری ہوئی صغریٰ کو سہارا دے کر اندر لے گئی۔

"میں دیکھ رہی ہوں گامو" سکینہ بولی "یا تو تم بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہو یا بے غیرت۔"

"ماں" گامو نے مرجھائے لہجے میں کہا اور نادم سا ہو کر اندر چلا گیا۔

جب وہ اپنے اپنے بستروں میں لیٹ گئے تو انھیں چبوترے کی طرف سے بلند آواز میں بین کرنے کی آواز سنائی دی۔

"کرماں ماریئے غفورو... اس رات، تیرا باپ بھی زندہ ہوتا تو تیری فریاد سن لیتا۔"

پھر اس کے دوہتڑوں سے چھاتی پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں جیسے غفوراں ابھی ابھی قتل ہوئی ہو۔

پولی تھین

جب سے میرے ننھیالی گاؤں کے قریب محکمہ آثار قدیمہ والوں نے ایک قدیم بستی دریافت کی تھی اور اخباروں میں اس کے بارے میں خبریں چھپنا شروع ہوئی تھیں میں پہلی بار یہاں آیا تھا۔

یوں اس بارے میں ماموں جان سے خط و کتابت تھی اور انھوں نے مجھے خطوط کے ذریعے کھدائی میں دستیاب ہونے والے کھنڈروں، برتنوں، پتھروں، اوزاروں، ہتھیاروں، زیوروں، ڈھانچوں، کھوپڑیوں اور دوسری چیزوں کے بارے میں بہت سی دلچسپ معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ مگر اب میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہی دشوار گزار بھوتوں کے مسکن ٹیلے جہاں سے لوگوں کو طرح طرح کی آوازیں اور چیخیں سنائی دیا کرتی تھیں اور جو وبال جان معلوم ہوتے تھے اب گاؤں کے بہت سے لوگوں کی روزی کا وسیلہ بن گئے تھے۔ ایک معمولی اور گمنام گاؤں ایک اہم قصبے کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ پکی سڑک سے گاؤں آنے والا کچا راستہ جس پر ذرا سی بارش کے بعد چلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ پختہ سڑک میں تبدیل ہو رہا تھا۔ سرکاری مکانات، کھدائی اور سڑک کی تعمیر کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں کو گھر بیٹھے روزگار مل گیا تھا۔

گاؤں کی دکانوں پر شہروں اور قصبوں کی طرح روز مرہ ضرورت کی ہر

چیز دستیاب تھی۔ اچھی برانڈ کے سگریٹ عمدہ کوالٹی کی چائے کی پتی اور خالص بناسپتی کے بند ڈبے، چائے اور شربت کے کئی ایک ہوٹل اور کھوکھے کھل چکے تھے۔ باغ علی عرف بگو ماچھی کی ماں نے گاؤں والا قدیمی تنور چھوڑ کر ٹیلوں کے قریب جہاں کھدائی ہو رہی تھی نیا تنور لگا لیا تھا۔ بغل میں رچھانی لیے ہاڑی سونی کے کارے پر خود کھیتوں اور گھروں میں جا کر حجامتیں بنانے والے عبداللہ نائی نے گاؤں سے باہر دکان کھول لی تھی اور ٹھنڈے پانی اور کھردرے ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر داڑھی مونڈنے کے بجائے اب وہ شیونگ سٹک اور کریم استعمال کرنے لگا تھا بلکہ شیو کرنے کے بعد پاؤڈر بھی لگاتا تھا۔

گاؤں میں اور بھی بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں مگر گلیاں اور نالیاں ابھی تک ناپختہ تھیں اور کیچڑ اور گوبر سے لت پت نظر آتی تھیں۔ سانسیوں کی ٹھٹھی کے قریب ایک نالی اتنی پھیل گئی تھی کہ مجھے کار وہیں روکنا پڑ گئی تھی۔

پہلے روز میں ٹیلوں کی سیر کرتا اور کھدائی کا کام دیکھتا رہا۔ اگرچہ پرانی بستی کے بارے میں ماموں جان کی خطوط میں لکھی گئی بعض قیاس آرائیاں ابھی تحقیق طلب تھیں۔ مگر زیادہ تر باتیں حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی تھیں۔ ان کھنڈرات اور ان میں سے برآمد ہونے والی اشیاء کی موہن جو داڑو اور ہڑپہ سے ملنے والی چیزوں سے گہری مماثلت تھی۔ انہی کی طرح کے ہوادار اور پختہ مکانات جن میں غسل خانے موجود تھے۔ گلیاں سیدھی اور نالیاں پختہ تھیں۔ روزمرہ ضرورت کی چیزوں اور زرعی آلات میں بھی مشابہت تھی۔ ایک قلعہ نما حویلی کے کھنڈرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں کوئی راجہ یا سردار رہتا تھا غالباً یہ بستی کسی زمانے میں اس علاقے میں مرکزی حیثیت رکھتی ہوگی۔ آثار سے پتہ چل رہا تھا کہ اگرچہ ان لوگوں کا بنیادی پیشہ کھیتی باڑی اور مویشی پالنا تھا مگر وہ بہت سے دوسرے پیشے اور ہنر جانتے تھے وہ فنونِ لطیفہ سے بھی واقف تھے خصوصاً رقص، موسیقی، مجسمہ سازی ظروف سازی، شاعری اور تحریر و تعمیر سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

میں نے محکمہ آثار قدیمہ کے کارندوں سے ملاقات کی۔ انتھروپالوجی کے ایک ماہر سے بھی تبادلہ خیالات کیا جس سے اندازہ ہوا کہ اس بستی کے لوگ خوش حالی اور امن و چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ اپنے عہد کے اعتبار سے خاصی ترقی یافتہ تہذیب اور ثقافت کے وارث تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ لوگ یوں ہی امن چین اور خوش حالی کی زندگی گزارتے رہتے تو اپنے لوگوں کو علم اور تہذیب و تمدن کی ترقی سے کبھی محروم نہ رکھتے۔ مگر پھر شاید غیر ملکی حملہ آوروں نے یلغار کر دی اور سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔ ان حملہ آور اجڈ اور وحشی قبائل نے گھروں کو جلا ڈالا اور بستی کو مسمار کر دیا فصلیں اجاڑ ڈالیں۔ اور لوگوں سے مویشی، اناج، زیورات اور عورتیں چھین لیں۔ مردوں کو تہ تیغ کر دیا یا انھیں غلام بنا لیا۔ بعض جنھوں نے طاعت قبول نہ کی جنگلوں بیلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور جب تک بن پڑا ان لٹیروں سے اپنی زمینیں اور عورتیں واپس لینے کے لیے برسرِ پیکار رہے جنھوں نے اصل باشندوں کو بے دخل کرنے کے بعد مسمار شدہ بستی کے قریب ہی نئے گاؤں تعمیر کر لیے تھے اور وہاں مستقل طور پر قابض اور آباد ہو گئے تھے۔ بے دخل کیے جانے والے بستی کے اصل باشندے آہستہ آہستہ بھوک، بیماری اور کس مپرسی کا شکار ہو کر کمزور پڑتے گئے۔ پھر انھوں نے نئی بستیوں کے قریب تالابوں کے کنارے ٹھٹھیوں اور جھگیوں میں رہنا شروع کر دیا اور چوہڑے چمار، گگڑے اور سانسی کہلانے لگے اور آہستہ آہستہ بھول گئے کہ کبھی وہ ان زمینوں اور بستیوں کے اصل وارث تھے۔

میرے لیے یہ سب باتیں نئی اور انوکھی تو نہ تھیں میں قدیم تہذیبوں کے بارے میں پڑھتا سنتا رہا تھا لیکن پھر بھی کسی مٹی ہوئی تہذیب کو اتنے قریب سے دیکھنے کا میرا یہ پہلا اتفاق تھا اور کتنی حیرت کی بات تھی کہ ایک بستی جو کھنڈر ہو گئی تھی ایک تہذیب جو مر گئی تھی وہ آثار کے ذریعے صدیوں کے بعد دوبارہ زندہ ہو گئی تھی مگر اس تہذیب کے وارث جو نامساعد حالات میں بھی

ہزاروں برسوں سے زندگی گزارتے چلے آئے تھے یہاں تک آتے آتے اصل میں کھنڈر ہو چکے تھے دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی مگر وہ اپنی زندگی اب بھی صدیوں پہلے کی طرح بلکہ اس سے بھی بدتر طریقے سے گزارنے پر مجبور تھے۔

شام کو میں گاڑی کا تیل پانی چیک کرنے گیا تو سانسیوں کی ٹھٹھی کا چکر لگا آیا۔۔۔۔ وہ بالکل مویشیوں کی طرح رہتے تھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بستی کے اجڑنے کے بعد وہ ابھی ابھی لٹ پٹ کر یہاں آئے ہوں اور ان کا یہاں مستقل یا زیادہ دیر تک رہنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

رات کو ماموں جان کی بیٹھک میں محفل جمی۔ گاؤں کے کچھ اور لوگ بھی موجود تھے بڑی دیر تک گپ شپ چلتی رہی۔ گفتگو کا زیادہ تر حصہ سانسیوں اور گگڑوں کی حالت، جرائم کی طرف ان کے رجحان، ان کی محرومیوں اور ان کے ماضی اور مستقبل کے متعلق تھا اور ہر شخص ان سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا۔ مگر ایک بات کی کسی کو سمجھ نہ آرہی تھی کہ وہ خود کو کس کے ساتھ منسوب کرے فاتحین کے ساتھ جو غاصب اور لٹیرے تھے یا مفتوحین کے ساتھ جو مردار کھاتے گندی جگہوں پر رہتے اور گندے مندے کام کرتے تھے۔

اس سے اگلے روز کا واقعہ ہے:

ہم سب گھر والے برآمدے میں بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ باہر کا دروازہ نیم وا پا کر ایک پلّا اندر گھس آیا۔ ماموں جان کی عادت ہے وہ کھانا کھاتے ہوئے ہڈیاں پلیٹ میں نہیں رکھتے زمین پر پھینکتے جاتے ہیں ممانی جان ان کی اس عادت سے بڑی تنگ ہیں ہڈی فرش پر پڑی ہو تو بلیوں اور کتوں کو کوئی کہاں تک روک سکتا ہے انھوں نے بڑے لڑکے احمد سے کہا کہ وہ پلے کو باہر نکال کر دروازہ بند کر آئے وہ کاہلی کا مارا ہوا ابھی اٹھنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ ایک کالا بھجنگ بڑا سا لڑکا جس کی شکل وصورت عجیب سی تھی دروازے

میں آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر ہمیں کھاتے پیتے دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا اندر آ گیا۔ ممانی جان نے احمد سے کہا کہ وہ پلے کے ساتھ اسے بھی باہر نکال کر دروازہ بند کر آئے مگر ماموں جان نے منع کر دیا۔ پھر انھوں نے روٹی پر تھوڑا سالن رکھ کر ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے روٹی ان کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور وہیں کھڑے کھڑے چٹ کر گیا۔ اس کے کھانے کا انداز عجیب سا تھا۔ کیا کہوں کیسا تھا بس یوں سمجھ لیجیے کہ کھاتے ہوئے وہ آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پوچھا:

"یہ کون ہے؟"

"یہ کالو ہے" ماموں جان نے جواب دیا "سائنسیوں کا لڑکا ہے بے چارہ بے عقل اور بے زبان ہے۔"

"سن بھی نہیں سکتا" چھوٹے لڑکے گگو نے بتایا۔

"صرف ڈنڈے کی زبان سمجھتا ہے۔" ثمینہ بولی۔

میں حیرت اور افسوس سے کالو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ثمینہ کہنے لگی:

"بھا جی ...... یہ بھی کھدائی میں نکلا ہے۔ اب اسے عجائب گھر میں رکھا جائے گا۔"

اس پر سب ہنسنے لگے۔

پھر ماموں جان نے ایک عجیب بات بتائی کہنے لگے۔

"جس طرح بعض بچوں کو مٹی، گاچنی یا کوئلے کھانے کی لت پڑ جاتی ہے اسی طرح کالو کو مومی کاغذ کھانے کا چسکہ ہے۔ وہ ہر وقت یہ کاغذ تلاش کرتا پھرتا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ مومی کاغذ سے ان کی مراد پولی تھین تھی میں نے پوچھا:

"یہ عادت اسے کب اور کیسے پڑی؟"

"ہمیں اس کا علم نہیں۔" ماموں جان کہنے لگے "اس کی ماں کو معلوم ہوگا۔

ہوسکتا ہے وہ بچپن میں اس کے منہ میں چوسنی کی جگہ مومی کاغذ کا ٹکڑا ڈال دیتی ہو تاکہ وہ اسے چبانے میں لگا رہے اور وہ کام کاج کرتی رہے۔ یا شاید اس نے شروع میں ایسے کاغذ کھائے ہوں جن کے ساتھ کوئی میٹھی یا نمکین چیز لگی ہوتی ہو۔ اب بچاری اس کی ماں سارا دن دکانوں، گلیوں اور اروڑیوں سے مومی کاغذ جمع کرتی رہتی ہے۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "کیا اس کے کھانے کے لیے؟"

"نہیں،" وہ کہنے لگے وہ یہ کاغذ جمع کر کے جلا دیتی ہے تاکہ کالو کے ہاتھ نہ لگیں اور وہ انھیں کھا نہ سکے۔ بستی کی دریافت سے بچاری کا کام بڑھ گیا ہے شہر سے آنے والوں کے ساتھ مومی کاغذ کے لفافے کثرت سے آنے لگے ہیں پھر گگو نے ہاتھ بڑھا کر تپائی پر رکھے مٹھائی کے ڈبے سے پولی تھین کا لفافہ اتارا اور اسے کالو کو دکھا کر ہوا میں اچھال دیا۔ پیڈسٹل فین کی ہوا سے پولی تھین کا خالی لفافہ صحن میں دور تک اڑتا چلا گیا۔ کالو لفافے کی طرف یوں لپکا۔ جیسے ...... کیا بتاؤں کیسے؟ ...... توبہ توبہ کرنی چاہیئے اور رب سچے کی قدرتوں سے ڈرتے رہنا چاہیئے ...... آخر اس نے لفافہ پکڑ لیا اور اسے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر یوں چبانے لگا جیسے چیونگم اور ببل گم چباتے ہیں۔

"اس بے چارے کو پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہیں ملتا اس لیے ایسا کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا پیٹ" ممانی بولیں "اندھا کنواں ہے کوئی کیسے بھر سکتا ہے۔"

ہاں بھاجی ...... ثمینہ کہنے لگی "اسے کھانے کے لیے جتنا دیتے جاؤ یہ کھاتا چلا جاتا ہے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ خواہ کتنی روٹیاں ہوں۔ آخر کار کھانا ختم ہوسکتا ہے مگر اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔"

"عجیب بات ہے،" میں نے کہا "مجھے تو یہ کوئی بیماری معلوم ہوتی ہے۔

کیوں ماموں جان" ماموں جان کے اندر کا طبیب جاگ پڑا۔ کہنے لگے۔
"ہاں ایک مرض ہوتا ہے یونانی طب میں اسے بولیموس کہتے ہیں۔ جوع البقر یعنی بیل کی بھوک اور جوع الکلب یعنی کتے کی بھوک بھی اسی کے مختلف نام ہیں۔ اس میں نہ مٹنے والی بھوک لگتی ہے۔ مریض کو بھوک کا ہوکا ہوتا ہے معدے کی مزمن سوزش سے بھی بار بار غذا کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔"
"کہیں ایسا تو نہیں" میں نے کہا "کہ کئی صدیوں کی بھوک اس کے اندر جمع ہو گئی ہو بھوک کا مرض جب تسلسل در نسل چلتا کرانک ہو جاتا اور آدمی کے خمیر میں شامل ہو جاتا ہے تو شکلیں بدل بدل کر انوکھے طریقوں سے اپنا اظہار کرتا ہے۔"
"بھاجی کی باتیں سن کر میری بھوک بھی مر گئی ہے۔" ثمینہ کہنے لگی "ابا جی آپ اس کا علاج کریں نا۔"
"اس کا کوئی علاج نہیں۔" ماموں جان نے کہا "اسے پرہیز کی ضرورت ہے جو وہ کر نہیں سکتا۔"
"علاج تو انسانوں کا ہوتا ہے۔" ممانی بولیں "یہ آدمی تھوڑی ہے اللہ نے عجیب مخلوق پیدا کی ہے مجھے تو یہ آدمی کی جون میں راکشس نظر آتا ہے جو اس گاؤں کی ہر چیز کو کھا جائے گا اور قحط پیدا کر دے گا۔ اس کا پیٹ دیکھ رہے ہو پورا دوزخ ہے۔"
"مجھے تو یہ پولی تھین کے لفافوں سے بھرا ہوا لگتا ہے۔" احمد نے کہا۔
اس پر پھر سب ہنسنے لگے۔ پھر گگو نے ڈنڈا لے کر پلے اور کالو کو باہر نکال دیا اور کنڈی لگا دی۔ اس کے بعد میں اپنے آبائی گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔
دو ایک روز وہاں قیام کیا۔ پھر واپس شہر آ گیا۔ مگر میں جب بھی بازار جاتا اور دکان دار مجھے ڈبل روٹی، انڈے، دودھ کے پیکٹ اور دوسرا سودا سلف پولی تھین کے لفافوں میں ڈال کر دیتے مجھے کالو یاد آ جاتا اور میں سوچتا، غنیمت ہے کہ وہ گاؤں میں رہتا ہے جہاں پولی تھین کے لفافے نسبتاً کم استعمال ہوتے

ہیں اگر وہ شہر میں ہوتا جہاں اب ہر چیز پولی تھین کے لفافوں میں ملتی ہے تو پتہ نہیں پولی تھین کھا کھا کر اس کا کیا حال ہوتا۔

پھر میں نے پولی تھین کی ماہیت اور کیمسٹری جاننے کی کوشش کی۔ دراصل میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ کس حد تک نقصان دہ ہے مگر مجھے کچھ زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے دو ایک ڈاکٹر دوستوں سے بھی دریافت کیا کہ پولی تھین کھاتے رہنے سے آدمی کو کیا اور کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے مگر انھوں نے کبھی اس انوکھی غذا کے بارے میں کسی کتاب میں پڑھا ہوتا تو مجھے کوئی ڈھنگ کا جواب دیتے۔

پھر آہستہ آہستہ مجھے یہ واقعہ بھول گیا۔ ویسے بھی میں نے یاد رکھ کر کیا کرنا تھا میں کالو کی کیا مدد کر سکتا اور اسے پولی تھین کھانے سے کیسے روک سکتا تھا۔ اس طرح سال دو سال کا عرصہ گزر گیا۔

ابھی چند روز ہوئے ماموں جان ہمارے پاس آئے تھے۔ رات کو ہم دیر تک بیٹھے گپ شپ کرتے رہے کھدائی سے مزید دستیاب ہونے والی چیزوں، گاؤں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں، رشتہ داروں کے لڑائی جھگڑوں اور گھریلو مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ ماموں جان تھکے ہوئے تھے میں انھیں آرام کرنے کا مشورہ دے کر جانے لگا تو اچانک مجھے کالو یاد آ گیا اور میں دوبارہ ان کے پاس بیٹھ گیا اور اس کی خیریت دریافت کی۔

"مر گیا ہے" ماموں جان نے مختصر سا جواب دیا۔

"اوہ" مجھے افسوس ہو رہا تھا "کب؟"

"کئی مہینے ہو گئے ہیں" ماموں جان نے جواب دیا "اچھا ہو گیا اس کی ماں بہت تکلیف میں تھی ہر وقت لفافے چنتی رہتی تھی۔"

"مجھے پہلے ہی ڈر تھا" میں نے کہا "وہ پلاسٹک کھا کر بیمار پڑ جائے گا اور جلد مر جائے گا۔"

"ہاں" وہ بولے مرا تو وہ پلاسٹک کے لفافے کی وجہ ہی سے تھا مگر کھا کر نہیں۔"

"کیسے؟"

"بجلی کے کھمبے پر اسے پلاسٹک کا لفافہ نظر آیا جو ہوا سے اڑ کر وہاں اٹک گیا تھا وہ کھمبے پر چڑھ گیا اور بجلی کا شاک لگنے سے مر گیا۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا مگر لوگ بتاتے ہیں کہ مرتے وقت بھی اس کے منہ میں مومی کاغذ کا ٹکڑا تھا۔"

نظر کا دھوکا

لڑکی تو گھر کی تھی زیادہ مشکل تو لومڑی کے حصول میں پیش آ رہی تھی۔
خیر دین کوشش میں تھا کہ آئے پر مل جائے۔ مگر اب تک کامیابی نہ ہوئی تھی مایوس ہو کر اس نے اعلان کر دیا۔
"اگر لومڑی نہ مل سکی تو اس مرتبہ میلے میں نہیں جائیں گے۔"
"کیوں ابا؟" فیکے نے پوچھا
"پتر۔ بکری میں لوگ اب دلچسپی نہیں لیتے پھر کم بخت ممیانے لگتی ہے۔"
"کوئی سانپ سپنی کوئی ناگ ناگن ابا؟" فیکا میلے میں جانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔
"وہ کھیل اب پرانا ہو چکا ہے" خیر دین نے جواب دیا۔
لومڑی نہ ملنے کی خبر سن کر وہ خوش ہو رہی تھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی اللہ کرے ابا کو کبھی لومڑی نہ ملے۔ مگر اس کی دعا قبول نہ ہوئی اور جب میلہ شروع ہونے میں تین چار روز رہ گئے تو ابا منہ مانگے دام دے کر لومڑی خرید لایا۔ اور لاوڈ اسپیکر پر اعلان کرنے کے سے انداز میں بولا:
"چلو چلو۔ تیار ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔"
ابا کا اعلان سن کر اس کا سر گھومنے لگا۔ میلے کا سارا شور کانوں میں گونجنے

لگا۔ اسے لگا وہ موٹر سائیکل پر سوار موت کے کنوئیں میں نیچے ہی نیچے گرتی چلی جا رہی ہے۔

وہ کئی برسوں سے تماشا بن رہی تھی۔ اس کے چہرے کے ساتھ کئی طرح کے دھڑ لگتے رہے تھے کبھی ناگن کا، کبھی بکری کا اور کبھی لومڑی کا۔ ایک ہی پوز میں پہروں بیٹھے بیٹھے اس کی کمر دکھنے لگتی، ٹانگیں شل ہو جاتیں۔ بعض اوقات اسے لگتا جیسے اس کا دھڑ بکری یا لومڑی میں تو نہیں البتہ پتھر میں ضرور تبدیل ہو گیا ہے۔ اسے اپنے چہرے سے جس پر اسے بہت ناز تھا نفرت سی ہوتی جا رہی تھی اسی کی وجہ سے اس کا باقی دھڑ بے معنی ہو گیا تھا اس کا جی چاہتا وہ چہرے سمیت اپنی گردن اتار کر رکھ جائے اور خود کہیں دور بھاگ جائے۔

تماشائیوں میں ہر عمر اور وضع کے لوگ شامل ہوتے۔ مگر صرف بچے حیرت، تجسس اور دلچسپی کا اظہار کرتے۔ بڑی عمر کے مرد اسے بھوکی اور للچائی نظروں سے دیکھتے لڑکے فقرے کستے، کوئی آنکھ مارتا، کوئی سیٹی بجاتا اور کوئی فحش اشارے کرتا۔ سارا وقت نظروں اور فقروں کے کنکر اسے اندر سے لہولہان کرتے رہتے۔ پھر بھی وہ جیسا اسے سکھایا گیا تھا مسکراتی رہتی اور ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش کرتی۔ اسے بت بنے بیکار بیٹھا رہنا بالکل اچھا نہ لگتا تھا۔ اسے تھیٹروں اور سرکسوں کی لڑکیوں پر رشک آتا جو حرکت میں رہتی تھیں کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھیں۔ گاتیں، ناچتیں یا کرتب دکھاتیں۔ میلے میں ہر جگہ ہر شخص حرکت میں رہتا۔ صرف وہی ایک پتھر بنی بیٹھی رہتی۔ تھکن اور اکتاہٹ کا شکار ہو کر بھی اسے خوش و خرم نظر آنے کا سوانگ رچانا پڑتا۔ بے ہودہ باتوں کو بھی خندہ پیشانی سے سہنا پڑتا۔ ناگوار چہروں کا بھی مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کرنا پڑتا اور یہ سلسلہ رات گئے تک چلتا رہتا۔ اور وہ اس قدر تھک اور اکتا جاتی کہ بعض اوقات اس کا جی چاہتا زور زور سے رونے اور چیخنے لگے۔ ذہنی اذیت سے بچنے کے لیے وہ کبھی کبھی اردگرد سے تعلق توڑ لیتی اور کہیں دور پہنچ جاتی

جاگتے میں میٹھے میٹھے سپنے دیکھتی۔ چہروں کے ہجوم سے کٹ کر اپنی پسند کا چہرہ تخلیق کرتی۔ ایسے عالم میں اسے پتہ ہی نہ چلتا کتنا وقت گزر گیا۔ کتنے اور کیسے کیسے لوگ آئے اور کیا کچھ کہہ کر چلے گئے۔ اگر وقت گزارنے کا یہ گُر اس کے ہاتھ نہ آتا تو وہ اب تک یقیناً گھبرا کر کہیں بھاگ گئی ہوتی یا پاگل ہو چکی ہوتی۔

"شیداں اب نہیں جائے گی" اس کی ماں نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"کیوں نہیں جائے گی" خیر دین نے بگڑ کر پوچھا۔

"اب وہ بڑی ہو گئی ہے۔"

"ایک سال میں؟"

"ہاں۔۔ پچھلے سال وہ چھوٹی سی تھی۔ لڑکیاں تو کھمبیاں ہوتی ہیں انھیں بڑھتے کچھ دیر نہیں لگتی۔"

"اچھا زیادہ باتیں نہ بنا اور اس کی تیاری کر۔"

"اب اس کا جانا ٹھیک نہیں کچھ تو خیال کرو۔"

"کچھ نہیں ہوتا تو اپنی بک بک بند کر۔"

"میں اسے اکیلا نہ جانے دوں گی ساتھ چلوں گی۔"

"تو وہاں کیا کرے گی۔"

"اس کا خیال رکھوں گی" خیر دین کو ہنسی آ گئی بولا

"سن رہے ہو فیکے۔ یہ اس کا خیال رکھے گی۔ کیوں ہم اس کے کچھ نہیں لگتے۔ باپ اور بھائی سے زیادہ لڑکی کی حفاظت کون کر سکتا ہے بے وقوف"

"جوان بیٹی کا خیال صرف اس کی ماں رکھ سکتی ہے خیر دینا۔"

"کیوں پہلے ہم خیال نہیں رکھتے رہے" فیکا بولا "کسی نے اس کا کچھ اتار لیا ہے کیا۔"

"تو چپ رہ فیکے" بھاگاں غرائی۔

"ٹھیک ہی تو کہتا ہے فیکا۔ پہلے کیا تم ساتھ جاتی تھیں؟"

"تب اور بات تھی اب وہ جوان ہوگئی ہے۔"
" تو ہم کیا اس سے . . ."
"بس بس" بھاگاں کو طیش آگیا۔" جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔"
" اچھا تو بھی اپنی بکواس بند کر۔"
" بیٹی کو کمائی کا ذریعہ بنایا ہوا ہے شرم کرو۔"
" شرم کس بات کی۔ محنت کرتے ہیں تماشا دکھاتے ہیں۔"
" اس دھوکے میں نہ رہنا خیر دینا کہ لوگ تماشا دیکھنے آتے ہیں وہ تمھاری بکری یا لومڑی کو دیکھنے نہیں تمھاری بیٹی کا چاند سا مکھڑا میلا کرنے آتے ہیں۔"
" اگر دیکھنے سے میلا ہوتا ہے تو ہونے دو۔"
" ہاں اماں" فیکا بولا" لوگ آتے ہیں دیکھ کر چلے جاتے ہیں کیا لیتے ہیں۔"
" شرم کر فیکے۔"
" تم فکر نہ کرو بھاگاں" خیر دین بولا" جیسی بھیجو گی ویسی ہی واپس لائیں گے"
" ہاں اماں بے شک تول لینا" فیکے نے مسخری کی۔
" غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے بے شرم"
" اس میں بے غیرتی کی کیا بات ہے اماں۔ لڑکی کا چہرہ۔ لومڑی کا بدن ۔ نظر کا دھوکہ"
" فیکے اپنی ماں کو بتا کہ غریب آدمی کو پیٹ پالنے کے لیے سو طرح کے جتن کرنا پڑتے ہیں۔"
" ہاں اماں بہت پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔"
" تم لوگ اب کوئی دوسرا دھندا کیوں شروع نہیں کر دیتے ؟ "
" اچھا اچھا وہ بھی کر دیں گے۔ چلو فیکے تم تیاری کرو۔"
اور تیاری شروع ہوگئی۔

شیداں نے اپنی ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں، کپڑے اور برتن سوٹ کیس میں رکھنا شروع کر دیئے۔ گرمی اور حبس کے دن تھے اسے پہروں اور پردوں کے درمیان جہاں ہوا کا گزر نہیں ہوتا تھا بیٹھنا پڑے گا اس خیال سے بھاگاں نے سارے کام چھوڑ کر اسے کپڑوں کا نیا جوڑا سی دیا۔ فیکے نے قناتیں، شامیانہ میز، سٹول اور دوسرا سامان باندھ دیا اور وہ چاروں خیر دین، فیکا، لڑکی اور لومڑی منہ اندھیرے روانہ ہو گئے۔

میلے کا پہلا دن عورتوں اور بچوں کے لیے مخصوص تھا اگرچہ اس میں بھی مردوں ہی کی تعداد زیادہ تھی۔ باتیں کرنے والی لومڑی میں بچے زیادہ دلچسپی لیتے تھے اس لیے خوب بکری ہوئی سارا دن ٹکٹ بکتے رہے۔ خیر دین بہت خوش تھا۔ اس نے دونوں وقت بہت اچھا کھانا منگایا۔ اسے آئس کریم بھی کھلائی اور چوڑیوں اور سک سرمے کے لیے بھی کچھ پیسے دیئے مگر اگلے روز بارش ہو گئی اور دن بھر وقفوں کے ساتھ بوندا باندی کا سلسلہ جاری رہا۔ کاروبار ٹھپ رہا مگر اسے آرام کرنے کا موقع مل گیا۔

میلے کا آج تیسرا روز تھا۔ اگرچہ گرمی بہت تھی اور ہوا بالکل بند تھی مگر صبح ہی سے جوق در جوق لوگ میلے میں امڈنا شروع ہو گئے تھے۔ دوپہر تک میلہ بھر گیا اور رونق عروج پر پہنچ گئی۔ کھوے سے کھوا چھلنے لگا۔ دکانوں اور کھانے پینے کی اشیاء کے اسٹالوں پر بھیڑ ہو گئی۔ مداریوں، سپیروں، جادو کے کمالات دکھانے، ریچھ سے کشتی لڑنے، جنسی طاقت کی دوائیاں بیچنے اور انگلی سے چھو کر درد کے بغیر دانت نکالنے والوں کے گرد تماشائیوں نے پرے بنا لیے تھے۔ تھیٹر آباد ہو گئے تھے۔ گانوں اور مکالموں کا شور باہر بھی سنائی دے رہا تھا۔ ایک طرف ہیر سیال بھنہ لے کر بیلے کی طرف روانہ ہو رہی تھی مگر راستے میں کسی نے ویل دے کر ٹوسٹ ڈانس کی فرمائش کر دی دوسری طرف میاں مجنوں بن میں لیلیٰ لیلیٰ پکارتا ہوا اچانک جگنی گانے

لگا۔ سرکس میں تماشائیوں کے لیے کرتبوں کے علاوہ بھی دلچسپی کی چیزیں تھیں۔ مرمریں ٹانگیں، کسے ہوئے بدن اور گلابی چہرے۔ ٹکٹ نہ خرید سکنے یا خریدنے کا فیصلہ نہ کر سکنے والوں کے لیے تھیٹروں، سرکسوں کے باہر دلچسپی کا سامان موجود تھا۔ بلند مچانوں پر مسخرے اور عورتوں کے لباس میں ہیجڑے فلمی گیتوں کی دھنوں پر ناچتے اور کولھے مٹکاتے۔ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلتی تو اس کی آواز دور دور تک سننے والوں میں جوش و اشتیاق پیدا کرتی۔ مردوں سے بھرے میلے میں ونجارنوں اور بھکارنوں کے علاوہ عورتیں صرف سرکسوں اور تھیٹروں کے اندر تھیں اس لیے سب لوگوں کا رُخ ادھر کو تھا۔ گھروں اور کھیتوں میں کام کرنے والی عام اور میلی کچیلی عورتوں کے مقابلے میں وہ انھیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آتی تھیں۔

خیر دین کا خیال تھا کہ آج خوب ٹکٹ بکیں گے مگر اب وہ پریشان ہو رہا تھا۔ صرف اِکا دُکا لوگ ہی ادھر کا رُخ کرتے تھے۔ لومڑی عورت کے انکلوژر کی تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر ہجوم کے بادل سارے میلے پر برس رہے تھے۔ لاوڈ اسپیکر پر بول بول کر اور لوگوں کو پکار پکار کر اس کا گلا بیٹھ چلا تھا۔

"لوگ ادھر کیوں نہیں آتے" اس نے فیکے سے سوال کیا۔

"لگتا ہے لوگوں کو لومڑی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ابا" فیکے نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کیوں فیکے؟"

"اب ہر آدمی اندر سے خود لومڑی بن گیا ہے ابا۔"

"وہ کیسے فیکے؟"

"وہ بکری اور لومڑی کی کہانی تمھیں یاد ہے ابا۔ لوگ چالاک اور خود غرض ہو گئے ہیں دوسروں کو گڈھے میں گرا کر اور ان کے کندھوں پر سوار ہو کر خود

باہر آجاتے ہیں۔"

"مگر پرسوں تو خوب رونق تھی فیکے۔"

"پرسوں عورتوں اور بچوں کا دن تھا ابا۔"

"پھر کیا کریں؟"

"اب کوئی اور دھندہ سوچ ابا۔"

"ہاں تمھاری ماں بھی یہی کہتی رہتی ہے۔"

خیر دین کو لومڑی پر اٹھنے والی رقم ضائع ہوتی نظر آرہی تھی۔ وہ کوئی دوسرا دھندہ شروع کرنے کے بارے میں پہلی بار سنجیدگی سے غور کرنے لگا مگر پھر ایک عجیب بات ہوئی۔

سہ پہر کے قریب جب حبس بڑھ گیا اور سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا ٹکٹ تیزی سے بکنے لگے اور پھر اس میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔

پہلے تو وہ خوش ہوا۔ مگر پھر یہ دیکھ کر چونکا کہ اندر جانے والے باہر آنے کا نام نہیں لیتے اور جن کو رش کی وجہ سے فیکا باہر نکلنے پر مجبور کر دیتا ہے وہ نیا ٹکٹ خرید کر دوبارہ اندر آجاتے ہیں۔ اس نے فیکے سے لوگوں کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ معلوم کرنا چاہی تو اس نے ہنس کر جواب دیا۔

"بس بھیڑ چال ہے ابا۔ لوگ جدھر رش دیکھتے ہیں دیکھا دیکھی ادھر ہی کا رخ کر لیتے ہیں۔"

"ایسا کبھی کبھی پہلے بھی ہو جاتا تھا اچانک تماشائیوں کا ریلا سا آجاتا اور پھر موت اور گاہک کا کیا پتہ کب آجائے اس خیال سے وہ مطمئن اور مسرور ہوا۔ اور دھڑا دھڑ ٹکٹ بیچنے میں مصروف ہو گیا۔

تماشائیوں کی تعداد اور جوش و خروش لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ ٹکٹ لینے والوں کی پہلی بار قطار لگ گئی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اس نے پھر فیکے کو اپنے پاس بلایا اور آہستہ سے پوچھا:

"خیر تو ہے آخر آج کیا بات ہو گئی ہے؟"

"سب ٹھیک ہے ابا۔"

"کوئی بات تو ہے؟"

"بس ابا گرمی بہت ہے" فیکا ہنسنے لگا۔

"یہاں کون سی برف پڑ رہی ہے فیکے؟"

"تم ٹکٹ بیچو ابا"

"مگر فیکے۔ یہ اچانک؟"

"کچھ نہیں ابا۔ بس نظر کا دھوکا" فیکا ہنستا ہوا چلا گیا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر اسے فیکے کی ہنسی عجیب عجیب اور معنی خیز محسوس ہوئی اس نے تھوڑی دیر کے لیے ٹکٹ بیچنا بند کیا اور خود مچان سے اتر کر تماشائیوں کے پاس آیا۔ اور یہ دیکھ کر ٹھٹھک گیا کہ پردہ سرک جانے کی وجہ سے لومڑی کے ساتھ ساتھ لڑکی کا اوپر کا دھڑ بھی صاف نظر آرہا ہے۔ پہلے تو اسے شبہ ہوا کہ وہ تماشائیوں ہی سے نہیں کرتے سے بھی بے نیاز ہو کر بیٹھی ہے مگر پھر فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ باریک کرتہ بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گیا اور جلد کی رنگت اختیار کر گیا ہے۔ اس نے شاید گرمی کی وجہ سے اور اس خیال سے کہ اس کا چہرہ ہی دکھائی دیتا ہے کرتے کے نیچے کچھ بھی پہننا ضروری نہ سمجھا تھا۔ اسے فیکے پر غصہ آیا وہ جلدی سے واپس اپنی جگہ پر آیا کہ فیکے کو ڈانٹ کر پردہ ٹھیک کرنے کو کہے اور خود شو بند کرنے کا اعلان کرے مگر پھر اس کی نظر تماشائیوں کی لمبی قطار پر پڑی اور وہ جلدی جلدی ٹکٹیں بیچنے میں لگ گیا۔

پنج کلیان

" مگر یار یہ سب ہوا کیسے ؟
" بس ہو گیا ۔۔۔۔ یوں سمجھ لو کہ درمیان میں ایک بھینس آگئی تھی "
" ہاں ۔۔۔۔ ایک راس بھینس ۔ پنج کلیان ۔ رنگ سیاہ ۔ سینگ کنڈھے "
" تم تو داہداری کا مضمون سنانے لگے ۔۔۔۔ ویسے بائی دی وے ۔۔۔۔
یہ پنج کلیان کیا ہوتی ہے ؟ "

" جس کے چاروں کھُر اور ماتھا سفید ہو کلیوں کی طرح اجلا ۔ ایسی بھینس کو خوب صورت سمجھا جاتا ہے ۔ یہ بھینس بھی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں بہت خوبصورت تھی مگر مارنے والی تھی "

" کیا مطلب ۔۔۔ کیا بھینسیں بھی مارتی ہیں ؟

" بعض جوشیلی اور غصیلی بھینسیں مارنے والی ہوتی ہیں اجنبی آدمی کو دیکھ کر بھڑک اٹھتی اور حملہ کر دیتی ہیں "

" اچھا یار ۔۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ سست الوجود اور صابر و شاکر قسم کا جانور ایسا بھی کر سکتا ہے "

" اچھا اب تو پتہ چل گیا ہے آئندہ محتاط رہنا "
" اچھا تو پھر کیا ہوا "

" ہونا کیا تھا۔۔۔ اسے بھی میرا مطلب ہے صبیحہ کو بھی تمھاری طرح نہیں علم تھا کہ مارنے والی بھینسیں بھی ہوتی ہیں۔"

" ہاں وہ ویٹرنری ڈاکٹر تھوڑی تھی جو اسے مویشیوں کے بارے میں کچھ پتہ ہوتا۔"

" اسے تو ابھی آدمیوں کے بارے میں بھی زیادہ پتہ نہ تھا مگر میں نے اسے مشورہ دیا کہ جب گاؤں آئے تو عام استعمال کی کچھ دوائیں اور فرسٹ ایڈ کا سامان وغیرہ ساتھ رکھے۔ گاؤں کی عورتیں اس سے دوا دارو کا تقاضا کریں گی اور اس سے اس کی ہی نہیں ہماری عزت اور وقار میں بھی اضافہ ہوگا۔"

" اس کے گھر والوں نے اسے بھیج کیسے دیا تمھارے ساتھ ؟"

" یار میرے ساتھ کہاں ۔۔۔ میں تو ایک ہفتے کی چھٹی لے کر پہلے ہی گاؤں چلا گیا تھا وہ اپنے بھائی سہیل کے ساتھ دو روز بعد وہاں پہنچی۔"

" پروگرام کیا تھا ؟"

" کچھ نہیں۔ گاؤں کی سیر کرنے۔ اصل میں تم جانتے ہو اس کے ڈیڈی ہر کام بڑے منظم طریقے سے کرنے کے عادی ہیں ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی بہانے خود اس ماحول اور گھر کو ایک بار دیکھ آئے جو اس کا سسرال بننے والا تھا۔"

" اچھا تو پھر ؟"

" پھر ہوا یہ کہ جب یہ لوگ گاؤں سے ایک میل ادھر نہر کے پُل کے پاس پہنچے تو سہیل کی نظر ٹمپریچر کی سوئی پر پڑی جو خطرے کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ اس نے گاڑی روک دی اور ایک خالی ڈبے میں نہر سے پانی لا لا کر انجن کو ٹھنڈا کرنے لگا صبیحہ کو شاید گرمی لگی وہ کار کا دروازہ کھول کر ایک طرف درخت کے سائے میں کھڑی ہو گئی، وہاں بر والوں کے مویشی چر رہے تھے۔ ان کے چرواہے کا نام بابا قادر ہے وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ ان مویشیوں میں وہ پنج کلیان بھینس بھی تھی جو کئی آدمیوں اور عورتوں کو زخمی کر چکی

تھی اور جس سے گاؤں کے لوگ کترا کر گزرتے تھے۔ گھاس چرتے چرتے وہ عین ہمیچہ کے قریب آ گئی اب صبیحہ کی بلا جانے کہ وہ کس کی بھینس تھی اور حملہ بھی کر سکتی تھی۔ اس نے دیکھا بھینس کی دائیں پسلیوں کے پاس ایک زخم تھا جس میں پیپ پڑ گئی تھی اور اس پر مکھیاں بیٹھی تھیں۔ اس کا ہمدردی کا جذبہ جاگا۔ پوری نہ سہی آدھی پونی ڈاکٹر تو تھی دوڑ کر گاڑی سے بیلاڈونا کی ٹیپ نکال لائی اور زخم صاف کر کے اس پر چپکا دی تاکہ مکھیوں سے زخم محفوظ رہے۔ جب بابا قادر نے کہیں سے نمودار ہو کر اسے خطرے سے آگاہ کیا اس وقت وہ اپنی مریضہ کی مرہم پٹی کر کے اظہار محبت کے طور پر اس کی تھوتھنی تھپتھپا رہی تھی۔ بابا قادر کے کہنے پر وہ وہاں سے ہٹ گئی اور جا کر کار میں بیٹھ گئی۔ بعد میں اسے بھینس کے بارے میں یہ جان کر بہت خوف آیا کہ وہ اس پر حملہ بھی کر سکتی تھی مگر اب اس خوف کی نوعیت ایسی تھی جیسی قریب سے سانپ نکل جانے کے بعد محسوس ہوتا ہے۔"

"اچھا تو بھینس کو یہ زخم کیسے آیا؟"

"یہ دو تین ہفتے پہلے کی بات تھی کہ اسے کھیت میں چرتے چرتے شتّا ہلا لڑ گیا تھا؟"

"کیا لڑ گیا تھا؟"

"شتّا ہلا۔"

"یہ کیا بلا ہوتی ہے؟"

"یہ ایک سستی اور معمولی قسم کی چارا گھاس ہوتی ہے اس میں زہریلے کیڑے ہوتے ہیں کاٹ اور کتر کر کھلائی جائے تو خطرہ کم ہو جاتا ہے ورنہ عام طور پر اس سے سخت قسم کا اپھارہ ہو جاتا ہے۔ مویشی کا پیٹ غبارے کی طرح پھول جاتا ہے کبھی خود ہی یا ٹونے ٹوٹکوں سے ٹھیک ہو جاتا ہے مگر بعض اوقات مویشی اس سے ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔"

" اگر ایسی ہی خطرناک گھاس ہے شٹاہلا تو کسان لوگ اس کی کاشت ہی کیوں کرتے ہیں۔"

" ڈوبنے کے ڈر سے لوگ دریا میں اترنا نہیں چھوڑ دیتے۔ غریب لوگ ناقص اور سستی چیزیں کھا کر بیمار پڑتے ہیں مگر وہی کچھ کھانے پر مجبور ہوتے ہیں شٹاہلا بھی ایک سستی اور جلد بڑھنے والی گھاس ہے بہرحال سیانے کسان اسے کھلانے سے پہلے کتر لیتے ہیں بلکہ اس میں کچھ سوکھا بھی ملا لیتے ہیں۔"

" اچھا تو بنج کلیان کو شٹاہلا لڑ گیا؟"

" ہاں ... اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حالت غیر ہوگئی۔ بابا قادر نے کسی لڑکے کو گاؤں دوڑایا کہ وہ بھینس کے مالکوں کو اطلاع دے اسے یہ بھی تاکید کی کہ کہیں سے سُوا لیتے آئیں۔"

" یہ سُوا کیا ہوتا ہے؟"

" سوئی کا مذکر سمجھ لو...... اسم مکبر کی تو تمھیں سمجھ نہیں آئے گی۔"

" کیوں سمجھ نہیں آئے گی جیسے نالی اور نالہ۔ گولی اور گولہ۔"

" ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر تم بات کرنے نہیں دیتے ہو درمیان میں اور سوال شروع کر دیتے ہو۔"

" ذرا میرا دیہات کے بارے میں جنرل نالج کمزور ہے۔"

" آخر ہونا شہری کے شہری۔"

" اچھا بابا اب نہیں بولتا مگر یہ سُوا کیا کرنا تھا تمھارے اس بابا قادر نے؟"

" جب مویشی کے بچنے کی امید نہیں رہتی تو ان لوگوں کے پاس آخری حل یہی ہوتا ہے کہ سُوا مار کر اس کے پیٹ سے ہوا خارج کر دیں۔ اس سوئے کے ساتھ چمڑے کا ایک کورسا ہوتا ہے وہ اندر رہ جاتا ہے اور سوا باہر نکال لیا جاتا ہے ہوا کور کے سوراخ سے باہر نکلتی رہتی ہے اس طرح عموماً مویشی کی جان بچ جاتی ہے اور دو چار ہفتوں میں زخم بھی بھر جاتا ہے مگر بعض اوقات

یہ زخم سیپٹک ہو جاتا ہے اور اس میں پیپ پڑ جاتی ہے۔ یہ زخم خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"اچھا تو سُوا مل گیا؟"

"نہیں جب کافی دیر تک گاؤں سے کوئی نہ آیا اور بھینس کی حالت غیر ہو گئی اور وہ جان کنی کے عالم میں زمین پر گر کر آخری سانس لینے لگی تو بابا قادر نے اپنی مسواک، کاٹنے والی چھری، اس کے معدے میں اتار دی۔ جس سے کچھ دیر تک گوبر ملی گیس کا فوارہ سا اُبلتا رہا اور تھوڑی دیر بعد بھینس نے بند ہوتی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بعد وہ ٹھیک تو ہو گئی مگر زخم ابھی مندمل نہیں ہوا تھا اس میں پیپ پڑ گئی تھی اور مکھیاں اسے ستاتی رہتی تھیں۔"

"ظاہر ہے صبیحہ نے اسے مکھیوں سے نجات دلائی تھی وہ اس پر حملہ کیوں کرتی۔"

"نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ جب صبیحہ نے زخم پر ابھی ٹیپ نہیں لگائی تھی تو بھینس کو کیا علم تھا کہ وہ میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں پڑھتی ہے اس کے بیگ میں بیلاڈونا ٹیپ ہے اور تھوڑی دیر بعد وہ اس کی مرہم پٹی کر دے گی۔"

"ہاں یار یہ تو واقعی تعجب کی بات ہے کہ بھینس نے اس پر حملہ کیوں نہیں کیا۔"

"اسی ایک بات کو لے کر گاؤں والوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا اور کئی طرح کی افواہوں نے جنم لیا۔"

"اچھا۔۔۔ کمال ہے۔ کوئی خاص بات ہو گئی؟"

"تم سنو تو۔۔۔ گاؤں میں جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو سارا گاؤں حیران رہ گیا کہ بروالوں کی بھینس نے ایک اجنبی شہری لڑکی پر نہ صرف یہ کہ حملہ نہیں کیا بلکہ اس کا ہاتھ چاٹتی رہی ہے۔"

"تو کیا بھینس نے صبیحہ کا ہاتھ چاٹا تھا؟"

" پتہ نہیں یار چاٹا تھا کہ نہیں چاٹا تھا۔ تم کیوں جیلس ہو رہے ہو۔"

" ہیں کیوں جیلس ہونے لگا۔"

" بس لوگوں نے بات گھڑلی۔ ویسے بھی بھینس کا ہاتھ چاٹنا یا صبیحہ کا بھینس کا منہ تھپتھپانا ایک ہی بات نہیں ہے؟ "

" ہاں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے دونوں باتوں میں۔"

" مگر لوگوں نے اسے اس طرح لیا جیسے وہ شیر کے پنجرے میں اتری ہو اور اس کی مونچھ کا بال اکھاڑ کر لے آئی ہو۔ لوگوں نے پر کا کوا بنا دیا ۔۔۔ اصل میں سب سے زیادہ گڑبڑ موقع کے واحد چشم دید گواہ بابا قادر نے کی۔ وہ ہر محفل میں بیان بدل کر اور حسب موقع اور ضرورت خوب نمک مرچ لگا کر ایک ہی واقعہ کو مختلف طریقوں سے بیان کرتا رہا۔ ابتدا میں تو اس نے بھی من وعن وہی کچھ بیان کیا، ہو گا جو پیش آیا تھا مگر اس کا کہنا تھا کہ شہری لڑکی نے بھینس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے کیل دیا تھا اور وہ اس کے اذن کے بغیر حرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ چناں چہ گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ لڑکی کالا علم جانتی ہے۔ خاص طور پر ضعیف العقیدہ عورتوں نے جن کی دیہات میں کمی نہیں ہوتی یقین کر لیا کہ لڑکی ضرور جادو ٹونا جانتی ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ بھینس اس پر حملہ نہ کر دیتی۔

" اچھا تو حملہ نہ کرنے کا اصل سبب کیا تھا؟ "

" جب تک تم پوری بات نہیں سنو گے تمھاری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔"

" چلو سناؤ"

" اگلے روز ہمارے ہاں دن بھر عورتوں اور لڑکیوں کا تانتا بندھا رہا وہ اس جادوگرنی کو دیکھنے آتی رہیں جو اپنے لباس ہیئر سٹائل میک اپ اور بول چال میں انھیں عجیب اور انوکھی معلوم ہوتی تھی۔ وہ میک اپ یا کنگھی کرنے سنگھار میز کے سامنے بیٹھتی تو چھوٹی بڑی لڑکیوں سے کمرہ بھر جاتا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ گاؤں میں اسے لیڈی ڈاکٹر کے طور پر کسی نے قبول نہیں کیا۔ یوں لگتا تھا وہ گاؤں

میں شوٹنگ پر آئی ہوئی کوئی مشہور ہیروئن ہے جس کے گرد لوگ جمع ہیں آیا سارا دن چھوٹی بڑی لڑکیوں کو دھکیل دھکیل کر باہر نکلتی رہتیں مگر وہ پھر آجاتیں۔ دروازے میں یا چھت اور سیڑھیوں پر جمع ہوتیں۔

" بڑی عمر کی عورتوں کا کیا ردعمل تھا ؟ "

" ہاں وہ بھی دلچسپ تھا ماسی اللہ رکھی آئی تو کہنے لگی بھلا بھینس نے اسے کیا مارنا تھا بے چاری خود مرمٹی ہوگی "۔ نمبردار فتح محمد کی بیوی بھاگ بھری کہنے لگی یہ تو خود سرتا پا جادو ہے اسے جادو ٹونے کی کیا ضرورت ہے شیرو میراثن نے کہا، صدقے جاؤں کیسے بھاگوں والی ہے جب سے اس گھر میں آئی ہے لوگوں کو اپنا گھر بوہا ہی بھول گیا ہے جہاں بیٹھتی ہے چانن ہو جاتا ہے رونقیں لگ جاتی ہیں۔ مگر سب سے دلچسپ ریمارکس ہماری ملازمہ داروکے تھے وہ بہت ہی خوش ہو رہی تھی کہنے لگی یہ اس گھر کی بہو بن کر آگئی تو مجھے ایسی مالکن مل جائے گی جو میرے گھٹنوں کے درد کا علاج بھی کرے گی اور جس کی اترن بھی میرے نئے کپڑوں سے اچھی ہوگی البتہ بعض عورتوں نے درمیان میں بیگی کا ذکر بھی کیا اور دبے دبے لفظوں میں اس کی تعریف کی۔ مگر کسی کو کھل کر بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔"

" وہ خود نہیں آئی ؟ "

" بیگی کے آنے جانے کا حال بھی بتاتا ہوں "۔

" پورا نام تو بیگماں ہوگا ؟ "

" ہاں ۔۔۔ یہ بیگی بھی میں نے ہی کہنا شروع کیا تھا۔ پھر سب لوگ اس کا یہی نام پکارنے لگے ۔ میں اسے بیگی کہتا تو وہ مجھے غلام کہہ کر چڑاتی "۔

" صبیحہ سے اس کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی ؟ "

" ہوئی تھی ۔۔۔ دوسرے روز سہ پہر کے وقت میں گھر پہنچا تو وہ برآمدے میں صبیحہ کے پاس بیٹھی تھی ۔ اس نے خلافِ معمول منہ پر بے ڈھنگے پن سے بہت سا سرخی پاؤڈر تھوپا ہوا تھا اور سستے قسم کے شوخ اور چمکیلے کپڑے پہن

رکھے تھے۔ شاید وہ ابھی ابھی آئی تھی اس خیال سے کہ وہ صبیحہ سے کوئی اوٹ پٹانگ بات نہ کہہ دے میں وہیں بیٹھ گیا۔ آپا اندر سے نکلیں تو اسے دیکھ کر ان کی ہنسی چھوٹ گئی کہنے لگیں "بیگی تجھے کیا ہوا ہے۔"

بیگی کو میں نے پہلی بار شرماتے دیکھا۔ آپا اسے بازو سے پکڑ کر نلکے کے پاس لے گئیں اور اس کا منہ دھلوا دیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی جب وہ بھیگی چڑیا کی طرح دوبارہ آکر بیٹھ گئی تو میں نے دیکھا میک اپ اتر جانے کے بعد اس کا چہرہ چنبے کی کلی کی طرح چٹک رہا تھا لمحہ بھر کے لیے خوف کا ہلکا سا سایہ صبیحہ کے چہرے پر ابھرا مگر پھر اس کی مسکراہٹ میں جذب ہو گیا۔

"تیرا ابا نوکری کرتا ہے" بیگی صبیحہ سے پوچھ رہی تھی مجھے اس کا یہ انداز گفتگو بہت برا لگا مگر میں خاموش رہا۔

"ہاں۔"

"میرا ابا نہیں ہے۔ زمینداری کا سارا کام نوکر چاکر ہی کرتے ہیں۔" اس نے نہایت بھونڈے انداز میں صبیحہ کے والد کا مرتبہ کم کرنے کی کوشش کی۔

"اس کی باتوں کا برا نہ منانا" میں نے صبیحہ سے انگریزی میں کہا جاہل اور گنوار لڑکی ہے۔"

"نہیں کوئی بات نہیں، صبیحہ نے بھی انگریزی میں جواب دیا" "بڑی پیاری لڑکی ہے۔"

"اسے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔"

"سیکھ سکتی ہے یہ کوئی مشکل بات نہیں" صبیحہ نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

آپا نے آواز دی۔

"بیگی تم یہاں آجاؤ میرے پاس۔"

"ادھر کیوں آجاؤں ...... میں ادھر جا بیٹھوں اور یہ یہاں گٹ پٹ

کرتے رہیں۔"

"بدتمیزی نہ کرو بیگی" میں نے غصے سے کہا "بیٹھنا ہے تو خاموشی سے بیٹھو مہمانوں کے ساتھ اس طرح سلوک نہیں کرتے۔"

"یہ مہمان نہیں ہے" وہ بولی "مجھے سب پتہ ہے۔"

"اچھا اب تم اپنے گھر جاؤ۔"

"کیوں جاؤں۔ یہ تمھارا گھر تو نہیں ہے میرے تایا کا گھر ہے۔ نہیں جاتی۔

اچھا ہم اٹھ جاتے ہیں چلو صبیحہ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "آئی ایم سوری فار آل دیٹ۔"

صبیحہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس کے بجائے بیگی اٹھ کھڑی ہوئی اور روتی ہوئی باہر نکل گئی۔ امی اور آپا دیر تک صبیحہ کو بہلاتی رہیں مگر لگتا تھا اس کے اندر کوئی چیز چبھ سی گئی ہے وہ بظاہر پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ایسا نہیں تھا شام کو آپا تنور سے روٹیاں لگوا کر آئیں تو مجھے ایک طرف لے جا کر انھوں نے بتایا کہ بیگی اور اس کی ماں نے گاؤں میں آفت مچا رکھی تھی۔ وہ گھر گھر جا کر داد فریاد کر رہی ہیں کہ ان کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔

چاچی کو پورا یقین ہے کہ شہر سے آئی ہوئی لڑکی جادو ٹونا جانتی ہے اور اس نے تمھیں تعویذ ڈالے ہوئے ہیں اور عنقریب اس گھر کی بہو بننے والی ہے ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ نمبردار کی بیوی بھاگ بھری آگئی وہ باری باری امی اور آپا کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی پھر مجھے ایک طرف بلا کر کہنے لگی۔

"ان بے چاریوں کا تم لوگوں کے بغیر اور کون ہے۔ تمھاری چاچی غصے والی ہے یہ میں مانتی ہوں مگر ناخنوں سے کبھی گوشت جدا ہوا ہے ویسے وہ دل کی بری نہیں سارا گاؤں جانتا ہے۔ اس نے پہاڑ سی جوانی کاٹ دی مگر کبھی کسی کو اس پر انگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ وہ تمھاری عزت ہے اسے سہارا دو گے تو لوگ بھی خوش ہوں گے اور خدا بھی۔ اور پھر سچی بات یہ ہے کہ بیگی جیسی لڑکی اس بارہ واس

میں مجھے تو نظر نہیں آتی" میں نے سب باتیں خاموشی سے سنیں اور ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔ مجھے چاچی پر غصہ آرہا تھا جس نے یہ سارا اودھم مچا رکھا تھا۔ مگر اگلی رات کو ایک اور واقعہ پیش آگیا جس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

جب ہم رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ اچانک دور سے کسی عورت کے بلند آواز میں بولنے اور بین کرنے کی آواز سنائی دی۔ صبیحہ اور سہیل کے سوا سبھی سمجھ گئے کہ یہ بگی کی ماں کی آواز تھی جب بھی کوئی افتاد پڑتی تھی وہ اسی طرح چھت پر چڑھ کر بین اور گریہ زاری کرنے لگتی تھی۔

"یہ کون رو رہا ہے؟" سہیل نے پوچھا۔

"ایک پاگل عورت ہے" آپا نے جواب دیا" اکثر راتوں کو چھت پر بیٹھ کر اپنے مرے ہوئے شوہر کو یاد کرتی اور چیختی چلاتی رہتی ہے۔"

میں یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ صبیحہ نے کوئی سوال نہیں کیا جیسے سب کچھ جانتی ہو امی کے کہنے پر وہ اٹھ کر اندر چلی گئی اور ٹی وی سے خبریں سننے لگی۔ ہم ایک ایک کر کے چھت پر آئے۔ پہلے تو بار بار بگی کا نام سن کر ہم یہی سمجھے کہ خدانخواستہ بگی کو کچھ ہو گیا ہے مگر پھر پتہ چلا کہ وہ بگی کا رشتہ ٹوٹنے کا ماتم کر رہی تھی۔

"تو کیا تمھارے ساتھ اس کے رشتے کی بات پکّی ہو چکی تھی؟"

"بالکل نہیں ...... چاچی نے امی اور آپا سے سرسری سا ذکر کیا تھا اور انھوں نے جواب دیا کہ وہ مجھ سے پوچھ کر بتائیں گی میں نے منع کر دیا تو بات وہیں رک گئی۔ مگر ان ماں بیٹی نے خود ہی سارے گاؤں میں رشتہ طے ہو جانے کی منادی کر دی تھی۔"

"پھر تو خیر ان کی زیادتی تھی۔"

"یہی بات تو مجھے سب سے بری لگتی تھی چاچی کی ضد بہت پکی تھی۔ اپنی ہر بات منوانا چاہتی تھی۔ بہت عجیب و غریب مزاج ہے اس کا دراصل اوائل عمری سے بیوگی کے صدمے جھیل جھیل کر وہ بے حد زود رنج اور جذباتی ہو گئی تھی ... بات

بات پر لڑنے مرنے کو تیار۔ بیگی بھی اپنی ماں پر گئی تھی۔ جوشیلی، غصیلی اور ضدی۔ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ مجھے غصیلی اور جھگڑالو عورتوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ زندگی عذاب ہو جاتی ہے ورنہ سچی بات ہے مجھے ان کے ان پڑھ یا دیہاتی ہونے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اور صبیحہ کا اس سے کیا موازنہ ۔۔۔۔۔ وہ زندگی سے یوں لبالب تھی کہ صبیحہ اس کے مقابلے میں کانچ کی خوب صورت مگر بے جان گڑیا معلوم ہوتی تھی۔"

"اب تو تم یہی کہو گے۔"

"نہیں اندر سے میں ہمیشہ ایسا ہی سمجھتا تھا۔"

"ہاں وہ تم چچی کے رونے کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں ۔۔۔۔ چچی نہایت سُر اور لَے کے ساتھ بین کر رہی تھی۔ ان کے بین گاؤں میں مشہور ہیں۔ جب کبھی گاؤں میں کوئی مرگ ہو جاتی ہے اور عورتیں ایک دوسری کے گلے لگ کر روتی ہیں تو چچی سب میں پیش پیش ہوتی ہیں، وہ جس عورت کے گلے لگ کر بین کرتی ہیں اسے رُلا رُلا کر ہلکان کر دیتی ہیں۔ اُن کے بین سن کر سنگ دل سے سنگ دل انسان کا دل بھی پسیج جاتا ہے اور اس وقت بھی وہ اسی طرح بین کر رہی تھیں جیسے کوئی مر گیا ہو۔"

"لوگ تو بہت متاثر ہوئے ہوں گے۔"

"ہاں ۔۔۔۔ تم یقین جانو جب ہم چھت پر کھڑے یہ بین سن رہے تھے تو خود ہمیں اپنے پاؤں تلے کی چھت سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ کھانا کھاتے لوگوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے ہوں گے۔ کئی عورتوں کے ہاتھوں سے برتن گر کر ٹوٹ گئے ہوں گے۔ گاؤں کی ہر چھت پر عورتیں اور آدمی نظر آ رہے تھے۔ بیگی کی ماں کے گرد عورتوں کا ہجوم تھا جو اسے تسلیاں دے رہی تھیں اور رونے سے منع کر رہی تھیں ان میں چودھری جہاں داد کی بیوی کنیز بی بی بھی تھی۔ جو بلک بلک کر رو رہی تھی۔"

"صبیحہ نے پھر کچھ نہیں کہا؟"

"میرا خیال ہے وہ بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ جو کچھ گاؤں کی ہوا میں تھا وہ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ آپا کو یہ بھی شک تھا کہ جو عورتیں دن بھر آتی جاتی رہی تھیں ان میں سے بیگی کی کسی ہمدرد نے چپکے چپکے اسے بہت کچھ بتا دیا ہوگا۔ ورنہ وہ اتنی گم صم نہ ہو جاتی۔ اگلی صبح اس نے اچانک روانگی کا اعلان کر کے ہمیں اور بوکھلا دیا۔"

"تم نے روکا نہیں؟"

"ہم نے کوشش کی وہ کچھ دن اور رُک جائے مگر وہ نہ مانی۔ سہیل پہلے ہی بور ہو رہا تھا ناشتے کے فوراً بعد وہ روانہ ہو گئے۔"

"اچھا تو کارواں چلا گیا؟"

"ہاں سات بجے کے قریب، ہم انھیں گاؤں سے باہر تک رخصت کرنے گئے واپس آئے تو چودھری جہاں داد کا پیغام ملا اس نے صبح ہی صبح مجھے ڈیرے میں بلا لیا تھا۔"

"یہ کون صاحب ہیں؟"

"یہ گاؤں کا ایک معمر چودھری ہے۔ زمین زیادہ نہیں ہے مگر سفید پوشی قائم ہے۔ پڑھا لکھا بالکل نہیں ہے مگر نہایت ذہین اور دانا آدمی ہے۔ گاؤں کے علاوہ قریبی دیہات اور تھانہ کچہری میں اثر و رسوخ رکھتا ہے اس لیے عام طور پر اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا ڈیرہ ایک طرح کی عدالت ہے جہاں جو مقدمہ پہنچ جاتا ہے لوگوں کو اس کے بارے میں یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا فیصلہ جلد اور صحیح ہوگا۔ میں خود اس کی بہت عزت کرتا ہوں مگر اس وقت مجھے بہت تاؤ آیا کہ آخر اسے میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے اور مجھے وہ ڈیرے میں طلب کر کے مجھ پر کیوں دباؤ ڈالنا چاہتا ہے کہ میں بیگی سے بیاہ کر لوں۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اسے کھری کھری سناؤں گا مگر اس نے موقع ہی نہیں دیا۔ اٹھ کر گلے لگایا نہایت شفقت سے پیش آیا اور میرے منع کرنے کے

باوجود چائے پانی کے لیے نوکر کو دوڑا دیا۔ پھر دوسرے لوگوں کو اٹھ کر ساتھ والی بیٹھک میں چلے جانے کو کہا۔ وہ اٹھ کر چلے گئے تو بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا "میں تمھارے کسی ذاتی معاملے میں دخل دینا نہیں چاہتا نہ ہی ایسے معاملات میں زبردستی کا قائل ہوں۔ لیکن رات جو کچھ ہوا بہت بُرا ہوا۔ تمھارے مہمان کیا سوچتے ہوں گے کہ کیسے گنوار لوگ ہیں اس گاؤں کے ...... یہ سوچ سوچ کر مجھے رات بھر شرمندگی اور پریشانی رہی .... سنا ہے وہ لوگ چلے گئے ؟"

"ہاں ابھی ابھی رخصت ہوئے ہیں۔"

"طاہر پتّر" اس نے اپنی لمبی لمبی سفید مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔" ان پڑھ آدمی ایک طرح سے نابینا ہوتا ہے تم پڑھے لکھے آنکھوں والے آدمی ہو تم بہتر جانتے ہو گے ویسے بھی تم جیسے پڑھے لکھے آدمی کی بیوی کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیے۔ ہمارا زمانہ اور تھا۔"

"یہ بات نہیں ہے" میں نے جواب دیا" بیگی میں صرف ایک عیب ہے کہ وہ اپنی ماں کی طرح غصیلی اور جھگڑالو ہے۔"

وہ ہنس پڑا کہنے لگا اگر صرف اتنی سی بات ہے تو پھر سمجھ لو کوئی بڑا مسئلہ نہیں، غصیلی، لڑاکا اور جذباتی عورتیں دل کی اچھی اور شوہروں کی بہت وفادار ہوتی ہیں۔ دیکھ لو تمھاری چاچی نے اپنے شوہر کی یاد میں پوری زندگی گزار دی ہے حالاں کہ بہت سے لوگ اس سے نکاح کرنے کے خواہش مند تھے۔ میرا خیال ہے اس کی لڑکی بھی بالکل ماں پر گئی ہے۔ بہت محنت کرنے والی اور وفا شعار بیوی ثابت ہو سکتی ہے مگر وہ تمھیں پسند نہیں ہے تو نہ سہی میں ان سے بات کروں گا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت پھر کبھی نہ کریں کہ تمھارے گھر والوں یا مہمانوں کو اس قسم کی پریشانی اٹھانا پڑے۔"

"آپ ضرور انھیں سمجھائیں چاچا ..... بہت عجیب عورتیں ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ بروالوں کی بھینس کے قصے سے لے کر رات کے ہنگامے تک انھوں نے

ہمارے مہمانوں کے سامنے، ہمیں کس قدر شرمندہ کیا ہے۔"

"ہاں طاہر پتر۔" میں وہ قصہ بھی سن چکا ہوں۔ بر والوں کی بھینس والا۔ مگر میرا خیال ہے چھری لگنے کے بعد سے اس بھینس کی کایا پلٹ گئی ہے اور اب اس نے مارنا چھوڑ دیا ہے اس میں تمھاری مہمان لڑکی کا کوئی کمال نہ تھا لوگوں نے خواہ مخواہ باتیں بنائیں" "یار تم نے پوچھا نہیں چودھری سے کہ اسے کیسے معلوم ہوا بھینس نے مارنا چھوڑ دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔" کہنے لگا پتر۔ جو آدمی بزدل اور ڈرپوک ہوتا ہے اور جسے خوف ہوتا ہے کہ اس پر کوئی حملہ نہ کر دے وہی حملے میں پہل کرتا ہے بالکل اسی طرح جو مویشی انسانوں سے بہت زیادہ خوفزدہ ہوتا ہے وہی ان پر حملہ کرتا ہے۔ میرا خیال ہے۔ بر والوں کی بھینس آدمیوں سے بہت ڈرتی تھی اسی لیے ہر کسی کو مارنے دوڑتی تھی مگر جب وہ نہایت تکلیف میں مبتلا تھی اس کے پیٹ میں چھری گھونپ کر اسے موت اور تکلیف سے نجات دلائی گئی چھری اور انسان کا خوف اس کے دل سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ اور اس پر یہ حقیقت کھلی کہ انسان چھری سے محض ذبح ہی نہیں کرتا تکلیف سے چھٹکارا بھی دلا سکتا ہے۔ یہ میرا اپنا اندازہ ہے کہ اب وہ کسی پر بھی حملہ نہیں کرے گی۔ میرا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"کمال ہے یار بڑا ذہین اور زیرک آدمی ہے تمھارا وہ چوہدری جہاں داد"

ہاں مگر مجھے اس کی کسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے اپنی ایسی ہی باتوں کے جال میں پھنسا رہا تھا۔ کیوں کہ گھوم پھر کر وہ پھر اسی موضوع کی طرف آ جاتا تھا جو اس کا اصل مدعا تھا کہنے لگا.......

" تمھاری چاچی اور بیگی نے بھی تم لوگوں سے اس لیے زیادتی کی ہے کہ وہ کمزور اور خوفزدہ ہیں۔ توجہ اور تحفظ کا احساس انھیں اس خوف سے نجات دلا سکتا ہے اور ان کی کایا بھی پلٹ سکتی ہے......."

میں ابھی کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ رحموں ترکھان کا لڑکا ہانپتا دوڑتا

ہوا آیا اور کہنے لگا کہ بیگی برو الوں کی حویلی میں گھس گئی ہے اور اس نے اندر سے کنڈی چڑھا رکھی ہے۔ اس کی ماں اور دوسرے لوگ اسے پھاٹک کھولنے کو کہہ رہے ہیں مگر وہ کسی کی بات نہیں مانتی۔

"کیا مویشی اب تک اندر ہیں" میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"ہاں جی بابا قادر بڑی دیر سے آتا اور انھیں چرانے لے جاتا ہے۔ ابھی اندر ہی ہیں اور وہ بھینس بھی۔"

"تمھارا کیا ردعمل ہوا؟"

"یار میری تو جان پر بن گئی۔ آخر میری چچازاد تھی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس روز سے زخمی ناگن کی طرح پھنکارتی پھرتی ہوگی جس روز سے صبیحہ اور بھینس کا واقعہ پیش آیا وہ ضرور یہ ثابت کرنا چاہتی ہوگی کہ وہ بھی بھینس کا سامنا کر سکتی ہے اور وہ جادو جو ایک شہری لڑکی جانتی تھی وہ اسے بھی آتا ہے۔ اس نے اسی ضد میں خود کو اس خونخوار بھینس کے حوالے کر دیا ہوگا جس نے ٹکریں مار مار کر اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی ہوگی۔ میں اس لڑکے کے ساتھ بھاگم بھاگ بروالوں کی حویلی پہنچا وہاں لوگ جمع تھے بیگی کی ماں چیخ چلا رہی تھی اور دو ہتڑوں سے سینہ کوبی کر رہی تھی۔ دو لڑکے اندر کود کر پھاٹک کھولنے کی کوشش کر رہے تھے میں نے بیگی کو زور زور سے پکارا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تمھاری آواز سن کر تو وہ اور بپھر سکتی تھی۔"

"شاید مگر اچانک کنڈی کھل گئی۔ ہم سب لوگ اندر کی طرف دوڑے۔ اندر ایک طرف چارہ کترنے کی مشین تھی۔ دوسری طرف دودھ دینے والی گائیں، بھینسیں اور بیل بندھے ہوئے تھے۔ باقی مویشی پچھلی جانب باڑے میں تھے جس کے اردگرد خاردار سوکھی جھاڑیوں کی باڑ تھی۔ میں آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مارنے والی پنج کلیان بھینس ایک طرف کھڑی جگالی کر رہی ہے اور بیگی اس کی گردن سے لپٹ کر رو رہی ہے۔ مجھے چوہدری جہاں داد کی ایک ایک بات

سچ معلوم ہونے لگی واقعی بھینس نے مارنا چھوڑ دیا تھا محبت اور تحفظ کے احساس
نے اس کا سارا خوف دور کر دیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑا
اور کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ میرے ذہن سے ساری دھند چھٹ گئی تھی میں نے
اسے اس کی ماں کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ چاچی اس بے وقوف کو بتاؤ کہ
غصّہ اور ضد نہ کیا کرے کچھ دیر تو چاچی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر اچانک وہ مجھ سے
لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ تیرے ساتھ غصّہ کرے گی تو میں اس کی ہڈیاں نہ توڑ دوں گی۔
بس یار یہ ہے سارا واقعہ - اب تو تمھیں پتہ چل ہی گیا ہو گا کہ یہ سب اچانک
کیسے ہو گیا۔"

"بہت اچھا ہو گیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔"

"ہاں، بس اللہ نے کرم کیا ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ واپس آکر تم صبیحہ کے گھر گئے ؟"

"نہیں یار ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے ؟"

"پنج کلیان سے۔"

بینگ اور سرطم

عجیب الخلقت بچے دنیا میں پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں یہ کوئی ایسی غیر معمولی اور اچنبھے کی بات نہیں تھی کہ سلطنت کے کسی دور دراز مقام پر کانوں کے بغیر ایک بچے کی پیدائش کی خبر سن کر بادشاہ پریشان ہو جاتا لیکن اگلے روز اور اس سے اگلے روز بھی جب وزیر نے ایسی ہی خبر سنائی کہ فلاں بستی میں فلاں فلاں شخص کے گھر کانوں کے بغیر بچے نے جنم لیا ہے تو بادشاہ ٹھٹکا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا؟ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ بادشاہ کی پریشانی کا بڑا سبب یہ تھا کہ ایک طویل مدت گزر جانے اور بڑی دعاؤں اور منتوں کے بعد ملکہ کی کوکھ ہری ہوئی تھی اور بادشاہ کو ولی عہد کی ضرورت اور خواہش تھی۔ اگر ملکہ کے ہاں بھی ایسا بچہ پیدا ہو گیا تو؟...... بادشاہ کو یہ سوچ کر جھرجھری آ گئی۔

اوپر تلے اس قسم کے کئی واقعات رونما ہوئے تو بادشاہ نے درباری دانشوروں اور امیروں وزیروں کا اجلاس بلایا اور ان واقعات کا سبب جاننا چاہا مگر کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ تاہم شاہی طبیبوں نے ملکہ کے لیے چند دوائیں تجویز کیں اور بعض پرہیز بتائے۔ مگر بادشاہ کو اطمینان حاصل نہ ہوا ادھر ہر دوسرے تیسرے روز خبر آنے لگی کہ ایک اور کانوں کے بغیر بچے نے فلاں بستی میں جنم لیا ہے۔

بادشاہ کی آنکھوں کی نیند اور دل کا سکون غارت ہو گیا۔ رات رات بھر جاگتا، پہلو بدلتا اور اٹھ اٹھ کر ٹہلتا اور سوچتا کہ اس مصیبت کا جو اس کی سلطنت پر نازل ہوئی تھی اور جس کا شکار وہ خود بھی ہو سکتا تھا سبب کیا تھا اور اس کا تدارک کیسے کیا جائے لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا البتہ ایک خیال بار بار اسے پریشان کرتا کہیں اس کا تعلق نور بانو کے واقعہ سے تو نہیں تھا۔

نور بانو ایک خانہ بدوش مغنیہ تھی اور لوگوں میں بے حد مقبول تھی۔ یہ بارہ برس پہلے کی بات تھی۔

شروع شروع میں جب بادشاہ تک نور بانو کی شہرت اور مقبولیت کی خبریں پہنچی تھیں تو بادشاہ نے اسے ایک معمولی لوک فنکارہ سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی تھی مگر جب راج دربار کے گویے اور موسیقار بھی اس کی آواز اور فن کی عظمت تسلیم کرنے لگے تو بادشاہ نے اپنے ایک مقرب کی وساطت سے نور بانو کو دربار سے وابستہ ہو جانے کی دعوت تھی مگر نور بانو لاکھوں کروڑوں پرستاروں سے کٹ کر دربار تک محدود ہو جانے پر رضامند نہ ہوئی۔ جس سے بادشاہ کے دل میں گرہ سی پڑ گئی۔ پھر ایک روز جب بادشاہ شکارگاہ کو جاتا تھا اس نے دارالسلطنت کے باہر راستے کے دونوں جانب لوگوں کا جم غفیر دیکھا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا کہ رعایا اس سے اس قدر خوش تھی اور اس کے استقبال کے لیے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے مگر وزیر نے یہ انکشاف کر کے بادشاہ کو حیران اور پریشان کر دیا کہ اس روز نور بانو دارالسلطنت میں آنے والی تھی اور لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے امڈ پڑے تھے۔

بادشاہ کے لیے اس سے بڑا اور کیا صدمہ ہو سکتا تھا کہ لوگ اس کی بجائے ایک معمولی گانے والی کے استقبال کے لیے جمع ہوں۔ بادشاہ کو نور بانو کا وجود خطرے کی علامت نظر آنے لگا۔ وزیر نے جلتی پر تیل ڈالا۔

”جہاں پناہ نے نہایت دانائی اور دور اندیشی کی بات کی ہے۔ ہوا سے

زیادہ سبک۔ اور لطیف۔ اور پانی سے زیادہ نرم اور رقیق۔ بہنے، ڈھلنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مگر جب ہوا زور پکڑ جائے تو آندھی اور بہت سا پانی جمع ہو جائے تو سیلاب بن جاتا ہے۔"

"نور بانو کو کل دربار میں حاضر کیا جائے، ہم اس کے فن کی داد دینا چاہتے ہیں۔" بادشاہ نے معنی خیز نظروں سے وزیر کی طرف دیکھا۔

"جو حکم عالی جاہ"

"اور ایک صاحب ذوق بھی..... جو اس کے فن کا قدردان ہو۔"

"غلام سمجھ گیا۔ حکم کی تعمیل ہوگی۔" وزیر با تدبیر نے جواب دیا۔

اگلے روز نور بانو کو اس کے سازندوں سمیت دربار میں پیش کر دیا گیا۔ اس محفلِ موسیقی میں بہت سے اہل ذوق مہمانوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ نور بانو نغمہ سرا ہوئی تو بادشاہ پر محویت کا عالم طاری ہو گیا اور وہ آنکھیں موند کر نہایت انہماک سے نور بانو کی آواز اور موسیقی کے سحر میں کھو گیا۔ درباری اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے جھوم رہے تھے مگر بادشاہ کی موجودگی میں خوبرو مغنیہ کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھنے کی کسی کو جرأت نہ تھی۔ تلواریں اور بھالے لیے جاں نثار پہرے داروں پر پتھر کے مجسموں کا گمان ہوتا تھا۔ کنیزوں کے ہاتھوں میں مورچھل بھی سازوں کے آہنگ اور تال پر حرکت کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مغنیہ کی ہوشربا آواز نے ماحول پر جادو پھونک دیا ہو دربار میں سوائے ایک مہمان کے کوئی بھی پوری طرح ہوش و ہواس میں نہیں تھا۔ یہ مہمان پہلی بار شاہی دربار میں شریک ہوا تھا۔ موسیقی کا نہایت اچھا ذوق رکھتا اور نور بانو کے فن کا پرستار تھا۔

فن فوری داد کا طلب گار ہوتا ہے اونگھتے ہوئے دربار میں نور بانو نے ایک ہی شخص کو متوجہ پایا تو وہ اس سے مخاطب ہو کر گانے اور داد پانے لگی اور شاہی عتاب کا شکار ہو گئی "بند کرو یہ بکواس" بادشاہ نے اچانک آنکھیں

کھول دیں اور گرجا۔

اونگھتا ہوا دربار جاگ پڑا۔ ساز چپ ہو گئے نغمے کے بول مغنیہ کے حلق میں اٹک گئے اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

حکم ہوا مغنیہ اور مہمان کو جو اس کا عاشق معلوم ہوتا تھا فوراً گرفتار کر لیا جائے اور بادشاہ کی محویت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے باہم اشارے بازی کرنے اور آدابِ شاہی کی توہین کے مرتکب ہونے کے جرم میں سورج نکلنے سے پہلے دونوں کے سر قلم کر دیئے جائیں اگلے روز شاہی فرمان کی تعمیل کر دی گئی۔

اس واقعے کی خبر آناً فاناً سارے ملک میں پھیل گئی۔ نور بانو کے فن کے پرستاروں اور موسیقی کے قدردانوں نے جگہ جگہ جلسے کیے اور جلوس نکالے۔ لوگ نور بانو کے گائے ہوئے گیت گاتے، سینہ کوبی کرتے اور بادشاہ کے خلاف نعرے لگاتے۔ اگرچہ ان جلوسوں اور ہنگاموں پر قابو پانے کے لیے پہلے سے خاطر خواہ انتظامات کر لیے گئے تھے پھر بھی رعایا اور شاہی فوج کے تصادم میں بہت سے لوگ مارے گئے بہت سی املاک تباہ ہو گئیں۔ بعض جگہوں سے احتجاج کے طور پر لوگوں کی خودسوزی کے واقعات کی خبریں بھی ملیں مگر بالآخر شورش پر قابو پا لیا گیا۔ تاہم لوگوں کے دلوں اور ذہنوں سے نور بانو کے نغموں کو نہ چھینا جا سکا۔ نور بانو کے گیت اب احتجاج کی علامت بن گئے تھے۔

مرنے کے بعد بھی نور بانو زندہ رہی اور اس کے گیتوں کی مقبولیت کم نہ ہوئی تو بادشاہ نے موسیقی پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ درباری دانشوروں اور مذہبی رہنماؤں کے ذریعے موسیقی کو لہو و لعب قرار دیا گیا۔ حکومت کے ایما پر اجتماعات اور عبادت گاہوں میں موسیقی کے خلاف تقریریں کی جاتیں اور اسے فسق و فجور سے تعبیر کیا جاتا اور لوگوں کو باور کرایا جاتا کہ موسیقی سفلی جذبات کو بھڑکاتی اور حیوانی جذبوں کو ابھارتی ہے فرد اور معاشرے کو کاہل اور بے عمل بنانے کی راہ ہموار کرتی ہے۔

کچھ عرصہ میں جونہی زمین وتر (نم) محسوس ہونے لگی اس میں ہل چلا دیا گیا۔ اور ملک بھر میں ناچنے اور گانے پر پابندی لگا دی گئی۔

دربار سے وابستہ قوالوں، موسیقاروں، رقاصوں اور گویوں کو رخصت کر دیا گیا۔ اس کے بعد شاہی فرمان جاری ہوا جس کے ذریعے رقص اور موسیقی سے تعلق رکھنے والے تمام فنکاروں کو ایک متعینہ مدت کے اندر ملک چھوڑ دینے کی ہدایت کر دی گئی۔ موسیقی کے تمام آلات، ساز اور ایسی اشیا جو سازوں کے طور پر استعمال کی جا سکتی تھیں جمع کر کے تلف کر دی گئیں اور آئندہ موسیقی کے آلات اور ساز بنانے یا بیچنے اور استعمال کرنے پر پابندی لگا دی گئی فرمان میں کہا گیا کہ جو شخص گاتا یا گنگناتا یا کسی بھی طرح کا ساز بجاتا پایا گیا اسے وہی سزا دی جائے گی جو گستاخ اور بے ادب نور بانو کو دی گئی تھی۔ پھر خفیہ پولیس کا ایک محکمہ قائم کر دیا گیا جس کے لوگ ہر شہر اور قصبے میں تعینات کر دیئے گئے وہ چھپ چھپ کر معلوم کرتے کہ کسی گھر میں کوئی گا تو نہیں رہا یا کہیں کوئی ساز تو بجایا نہیں جا رہا۔ جونہی کوئی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا اسے پکڑ کر سخت سزا دی جاتی۔

اگرچہ موسیقی کے تمام ساز اور آلات تلف کیے جا چکے تھے مگر بعض لوگ پھر سے چھوٹے موٹے ساز بنا لیتے تھے اس قسم کے لوگوں کی آئے روز گرفتاریاں ہوتی رہتی تھیں۔ انھیں کڑی سزائیں دی جاتیں۔ کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہیوں میں پھینک دیا جاتا..... زبانیں کاٹ دی جاتیں، اعضا قطع کر دیئے جاتے۔

ایک چرواہے کو حقّے کی نے میں چھید کر کے بانسری کی طرح بجاتے ہوئے پکڑا گیا۔ ایک کسان کو جنگلی کدو سے بین ایسا ساز تیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ شہر کے دو مختلف حصوں سے دو فقیروں کو پکڑا گیا، ایک کسی جانور کے سینگ سے بنا ہوا ناد بجاتا پھرتا تھا دوسرا چمٹے کے ساتھ گا کر بھیک مانگتا تھا۔ ایک روز کھلونے بیچنے والی ایک عورت گرفتار ہوئی اس کی کھٹاری

سے مٹی اور کاغذ کے بنے ہوئے بہت سے گھگھو گھوڑے اور ڈمرو برآمد ہوئے۔ ایک کم سن بچے کو البتہ تنبیہ کر کے چھوڑ دیا گیا وہ گندم کی بالی سے پیپی (سیٹی) بنا کر گلی میں بجاتا پھر رہا تھا۔

شعر و نغمے کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے بعض درباری بزر جمہروں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ جب تک شعر باقی ہے نغمے کو پوری طرح مٹایا نہیں جاسکتا۔ اس لیے شعر کہنے اور پڑھنے پر بھی پابندی ضروری ہے۔ بادشاہ نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور شعر و شاعری کا تمام سرمایہ جو کتابوں یا رسالوں اور قلمی نسخوں کی صورت میں دستیاب ہو سکا جمع کر کے اسے نذر آتش کر دیا گیا۔ شاعر یا تو ملک چھوڑ کر چلے گئے یا پھر شعر و شاعری سے تائب ہو کر دوسرے مفید کاموں اور پیشوں سے وابستہ ہو گئے۔

شعر و نغمہ اور رقص و موسیقی اب بادشاہ کی چڑ بن گئے تھے اس نے سزائیں اور کڑی کر دیں۔ آخر آئے دن کی گرفتاریوں اور کڑی سزاؤں سے خوف زدہ ہو کر لوگوں نے ناچنے، گانے اور ساز بجانے سے توبہ کر لی۔ ماؤں نے بچوں کو لوریاں دینا ترک کر دیا۔ لوگ گفتگو اور تقریر کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھتے کہ ان کی آواز میں ترنم اور آہنگ پیدا نہ ہو جائے۔ عورتوں نے مرگ پر بین کرنا چھوڑ دیے۔

آہستہ آہستہ زندگی پھیکی اور بے مزہ ہونے لگی، محفلیں اجڑ گئیں اور ایک نامعلوم سی اداسی اور تنہائی کا احساس روحوں کے اندر اتر گیا۔ مگر بادشاہ نے اپنی دلچسپی کی نئی نئی راہیں نکال لی تھیں۔ کشتی، تلوار بازی، تیر اندازی اور نیزہ بازی کے مقابلے منعقد کرائے جاتے۔ آدمیوں اور ریچھوں کو لڑایا جاتا۔ نہتے قیدیوں کا بھوکے شیروں سے مقابلہ کرایا جاتا۔ بڑی بڑی فرشی بساطوں پر باوردی غلام اور کنیزوں کو کھڑا کر کے بادشاہ اور امیر وزیر پہروں جھروکوں میں بیٹھ کر شطرنجی چالیں چلتے۔ لیکن جلد ہی ان چھوٹے چھوٹے مقابلوں اور کھیل تماشوں

سے بادشاہ کا دل بھر گیا۔ ادھر لوگوں اور لشکریوں کے مزاج میں تشدد اور کھردرا پن اور تندی آگئی تھی اکثر باہم لڑائی جھگڑے اور خونریزیاں ہونے لگیں۔ سارا ملک گروہوں اور طبقوں میں بٹ گیا اور ہر جگہ فتنہ وفساد برپا ہو گیا۔ ایذا پسندی تشدد اور توڑ پھوڑ لوگوں کا شعار بن گیا۔ اب ایک ہی راستہ باقی تھا۔ جہاں بانی اور مہم جوئی۔ جس سے بادشاہ کا دل بھی لگا رہتا اور لشکر اور عوام کے تشدد پسندی کے رجحان کی بھی تسکین ہو سکتی تھی۔ سو بادشاہ نے آس پاس کے چھوٹے ممالک اور ریاستوں پر لشکرکشی شروع کر دی جس کے نتیجے میں فسادات کم ہو گئے دوسری طرف مزید اسلحہ اور مال غنیمت ہاتھ آیا۔ جس سے مزید لشکرکشی کا رجحان پیدا ہوا اب جب بھی اندرونی حالات زیادہ ابتر ہونے لگتے بادشاہ کسی نئی مہم پر نکل کھڑا ہوتا۔

سلطنت کی سرحدیں اب خاصی وسیع ہو گئی تھیں اور بادشاہ اپنی فتوحات سے خوش تھا۔ اگرچہ بعض اوقات رقص اور موسیقی کے بغیر فتح کے جشن ادھورے ادھورے محسوس ہوتے مگر اس کمی کو آتش بازی، چاند ماری اور خورد ونوش سے پورا کرنے کی کوشش کی جاتی۔

لیکن پھر آہستہ آہستہ لوگ اور لشکری آئے دن کی مہم جوئیوں سے تنگ آ گئے اور بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

کچھ ہی عرصہ بعد ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی لوگوں میں نشہ آور مشروبات اور جڑی بوٹیوں کی رغبت اور رجحان بڑھنے لگا۔ طرح طرح کے نشے رائج ہو گئے۔ بادشاہ متفکر رہنے لگا کیوں کہ لشکر میں بھی ان چیزوں کا استعمال عام ہو چلا تھا۔ جس سے ملک کا دفاع اور حکومت کا استحکام خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ بادشاہ کو رہ رہ کر خیال آتا کہ کہیں در پردہ معاشرے میں موسیقی کسی اور روپ میں موجود نہ ہو۔ بادشاہ کو اب یقین ہو گیا تھا کہ اس کی فتوحات اور کامرانیاں جبھی ممکن ہو سکی تھیں جب اس نے موسیقی کو دیس نکالا کر دیا تھا۔

ایک روز بادشاہ محل میں آرام کر رہا تھا کہ ستون کے کنگرے پر ایک سیاہ رنگ کا پرندہ آ بیٹھا اور نہایت خوش الحانی سے چہچہانے اور کو ہُو کو ہُو الاپنے لگا۔

بادشاہ کو ایسا لگا جیسے وہ پرندہ نور بانو کی بدلی ہوئی صورت ہو اور اسے چڑا رہا ہو بادشاہ نے کمان پر تیر چڑھایا اور پرندے کو ہلاک کر ڈالا۔

اگلے روز ایک اور شاہی فرمان جاری ہوا کہ سلطنت کی حدود میں چہچہانا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے اور ایسا ہر پرندہ مارنے پر انعام دیا جائے گا جس کی آواز اور چہچہاہٹ پر موسیقی یا غنائیت کا شبہ ہو سکتا ہو۔ ملک بھر میں چڑی مار اور شوقیہ شکار کرنے والے خوش الحان پرندوں کے شکار کو اٹھ کھڑے ہوئے اور چند ہی روز میں ملک سے بلبلوں، قمریوں، کوئلوں، پپیہوں، فاختاؤں، چڑیوں اور موروں کو ختم کر دیا گیا۔

سلطنت میں اب کہیں سے گانے، گنگنانے، چہچہانے اور ساز بجانے کی آواز سنائی نہ دیتی تھی مگر منشیات کے استعمال میں کمی نہ ہوئی۔ لڑائی جھگڑوں اور خونریزیوں کے واقعات میں اضافہ ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو لہولہان کر دیتے، ایک دوسرے کی تکا بوٹی کر دیتے۔ دشمن کو طرح طرح کی تکلیفیں دے کر ہلاک کیا جاتا۔ خون بہانے کے لیے کوئی دشمن نہ ملتا تو اپنے پیٹ یا چھاتی میں خنجر گھونپ لیتے۔

پھر سلطنت کے بعض حصوں سے اس قسم کی خبریں آنے لگیں کہ فلاں قصبے یا شہر میں فلاں آدمی کے سر پر سینگ اُگ آئے ہیں بعض عورتوں کے چہروں پر مونچھیں اور داڑھیاں نکلنے کی اطلاعات بھی ملنے لگیں۔ مگر اس سے حکومت پر کیا اثر پڑ سکتا تھا بادشاہ نے ان خبروں کو کوئی اہمیت نہ دی۔

آہستہ آہستہ سینگوں والے مردوں اور مونچھوں والی عورتوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ لوگ رات کو اچھے بھلے سوتے مگر صبح اٹھ کر آئینہ دیکھتے یا سر اور چہرے پر ہاتھ پھیرتے تو ان کے سینگ اگ آئے ہوتے یا مونچھیں نکل آئی ہوتیں۔ کچھ ہی

عرصہ میں ملک بدمزاج اور بدشکل لوگوں سے بھر گیا۔ مگر بادشاہ قطعاً پریشان نہیں تھا۔ رعایا خوب صورت ہو یا بدصورت اس سے کیا فرق پڑتا ہے وہ سوچتا غلامی اور بدصورتی کا ویسے بھی پرانا ساتھ ہے لیکن اب بے کانوں کے بچوں کی پیدائش نے بادشاہ کو پریشان کر دیا تھا۔ اگر ملکہ نے بھی، کانوں کے بغیر بچّے کو جنم دیا تو؟ یہ سوچ کر بادشاہ کو جھرجھری آجاتی۔

بادشاہ رات بھر ٹہلتا اور سوچتا رہا آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر نور بانو کے واقعے اور موسیقی سے کانوں کے بغیر بچوں کی پیدائش کا تعلق نہ بھی ہو تو بھی مصلحت اور احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ ملکہ کے لیے موسیقی کا انتظام کر دیا جائے مگر اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ شعر و نغمہ یا موسیقی کا انتظام کیسے کیا جائے ملک بھر میں مغنّیوں اور موسیقاروں کی تلاش ہوئی پڑوسی ممالک کی طرف ہرکارے دوڑائے گئے ساز تیار کرنے کے احکامات بھی دے دیئے گئے مگر اس سے پہلے کہ کوئی ساز تیار ہوتا، یا کوئی مغنی محل میں داخل ہوتا ملکہ نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ لیکن یہ دیکھ کر بادشاہ کے ہوش اڑ گئے کہ ولی عہد کانوں سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی محروم تھا!

ریپلیکا

(تاج محل کی سیر)

ہم دلی سے آگرہ جا رہے تھے۔
دسمبر کا آخری سورج ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ دھند پھیلی ہوئی تھی اور زیادہ فاصلے سے چیزیں نظر نہ آتی تھیں۔ مگر جوں جوں ہم شہر سے دور ہوتے گئے دھوپ پھیلتی گئی اور کہر چھٹنے لگی۔
میں رات دیر سے سویا تھا اس لیے ذہن پر بھی دھند چھائی ہوئی تھی اور بار بار اونگھ سی آجاتی۔ مگر میں بند آنکھوں سے بھی دور تک دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا وقت اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا تھا بگاڑ بھی نہ سکتا تھا اس کے کنول چہرے پر وہی برسوں پہلے والی ملائمت اور تازگی تھی۔ وہ بہت مسرور نظر آتی تھی۔ اس کی تاج محل دیکھنے کی دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔
ہم جب سے انارکلی اور نورجہاں کے شہر سے آئے تھے اس نے تاج تاج کی رٹ لگا رکھی تھی تاج کے علاوہ اسے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی وہ میرے ساتھ مشاعرے میں بھی نہیں گئی تھی حالاں کہ کسی زمانے میں وہ میری شاعری پر سچ مچ کا تاج محل قربان کر سکتی تھی مگر اب اسے صرف تاج محل سے دلچسپی تھی اور وہ یوں بیتاب ہو رہی تھی جیسے تاج محل اسی کے لیے تعمیر کیا گیا ہو اور اسے پکار رہا ہو۔

قبراں اڈیکدیاں.........جیوں پتراں نوں ماواں

"ایسا لگتا ہے جیسے خواب ہو۔"

"کیا پتہ خواب ہی ہو۔"

"نہیں...... اگر خواب ہوتا تو ہماری عمروں میں اتنا فرق نہ ہوتا۔"

میں نے پریشان ہو کر کھڑکی کے شیشے میں اپنا عکس دیکھا تو حیران رہ گیا۔

"یہ تو میرا چہرہ نہیں ہے۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

اس نے پرس سے چھوٹا سا آئینہ نکال کر مجھے دیا اور بولی۔

"تو کیا تمھیں اپنا چہرہ بھی بھول گیا ہے؟"

میں نے آئینے میں دیکھا۔ اس میں جس چہرے کے نقوش نظر آ رہے تھے وہ میرے چہرے کے نقوش سے ملتے جلتے ضرور تھے جیسے اصلی تاج محل اور بازار میں بکنے والے اس کے ماڈلوں میں مشابہت ہوتی ہے لیکن یہ میرا چہرہ ہرگز نہیں تھا۔ آنکھیں، پیشانی، ناک اور سر کے بال کوئی بھی چیز میری نہ تھی البتہ ایک سیاہ تل بہت مانوس دکھائی دیتا تھا ایسا لگا جیسے کوئی سوتے میں میرا دمکتا ہوا چہرہ چرا کر لے گیا ہو اور اس کی جگہ جھریوں اور سفید بالوں والی گردن میرے کندھوں پر لگا گیا ہو۔

مگر یہ تل؟ شاید مجھے دھوکا دینے کے لیے کسی نے عین اسی جگہ داہنے گال کے نیچے چپکا دیا تھا جہاں میں اسے دیکھنے کا عادی تھا میں نے رومال سے چہرے کو زور زور سے رگڑا اور تل کو صاف کرنا چاہا مگر لگتا تھا اسے کسی عمدہ قسم کے سلوشن سے لگایا گیا تھا۔ پردیس میں اپنا چہرہ چوری ہو جانے سے میں بہت پریشان ہوا۔ اس سے کئی طرح کی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں میں نے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ سے آئینے میں نظر آنے والے چہرے کا موازنہ کیا اور سخت گھبرا گیا میں نے کہا:

"یہ چہرہ ہرگز میرا نہیں ہے۔"

"تم ناحق پریشان ہو رہے ہو۔ یہ تمھارا ہی چہرہ ہے۔"

"کمال کرتی ہو کیا میرے چہرے کو نہیں پہچانتی ہو؟"

"پہچانتی ہوں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔"

تو کیا یہ وہی چہرہ ہے جسے تم پہچانتی ہو؟"

"نہیں ...... یہ بالکل وہی تو نہیں مگر میں سمجھتی ہوں اتنے برسوں میں کافی تبدیلی آسکتی ہے۔"

"تبدیلی ضرور آئی۔ آنی بھی چاہیے مگر میں اپنے چہرے کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ ہر روز دیکھتا ہوں مجھے مغالطہ نہیں ہو سکتا۔"

"تم نے صبح شیو بھی تو کی تھی؟"

"ہاں میں نے شیو کی تھی مگر بہت جلدی تھی میں نے غور نہیں کیا۔ البتہ رات کو جب میں ٹوتھ برش کر رہا تھا آئینے پر نظر پڑی تھی اور وہ میرا اپنا چہرہ تھا۔"

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اگر ایسا ہوا ہے تو تمھارا چہرہ کہاں گیا۔ کون لے گیا؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

مجھے ہوٹل کا بیرا یاد آیا۔ پھر منیجر ...... اور وہ پُر اسرار سا شخص بھی جو لابی میں بیٹھا رہتا تھا اور مجھے عجیب مشکوک نظروں سے گھورتا رہتا تھا۔

"گاڑی روکو" میں نے تقریباً چلا کر کہا "میرا چہرہ پیچھے رہ گیا ہے شاید کسی سے بدل گیا ہے۔"

سب لوگ پلٹ کر مجھے دیکھنے لگے پھر ساتھ والی سیٹ کے سردار جی نے اپنا چہرہ ہاتھ میں لے کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا:

"ایہہ پسند جے تے آپاں نال بدل لوو۔"

اس پر ہر طرف سے قہقہے سنائی دینے لگے مجھے اپنی حرکت پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

پچھلی سیٹ سے ایک بڑے میاں نے سرد آہ بھری اور بولے۔

"چہرہ تو میرا بھی بہت پیچھے رہ گیا ہے۔"

"تسیں وی بدل لئو جی۔" سردار جی نے ایک کالے کلوٹے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"ان کے ساتھ"

ایک بار پھر قہقہے گونجنے لگے۔ کالے کلوٹے شخص کے چہرے پر درشتی کے آثار نمودار ہوئے مگر دوسرے ہی لمحے اس کی پیشانی کی سلوٹیں خود بخود ہموار ہوگئیں کسی مسکراتے ہوئے خیال کے زیر اثر وہ بولا:

"ہاں جی بدل لیں ... بے شک مفت لے لیں۔ میں آگرہ جاکر ماربل کا نیا بنوالوں گا۔"

سب لوگ ہنسنے لگے۔

"یہ مہمان ہیں اور شاید پریشان ہیں۔" ادھیڑ عمر کا ایک سنجیدہ چہرے والا شخص بولا آپ لوگ ان کا مذاق نہ اڑائیں۔"

"لہوروں آئے او؟" سردار جی نے پوچھا۔

"ہاں جی۔"

"جی آیاں نوں ... سر متھے تے۔"

"شکریہ۔"

"چھما کرنا ویر جی۔" سردار جی ہاتھ جوڑ کر بولے "مذاق کا برا نہ منانا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"کوئی پریشانی ہے صاحب؟" سنجیدہ چہرے والا ادھیڑ عمر بولا۔

"ہاں۔ نہیں۔ بس یوں ہی کچھ یاد آگیا تھا۔"

اسی لمحے ٹیلی وژن پر فلم شروع ہوگئی اور سب لوگوں کی نظریں سکرین پر لگ گئیں۔

ہیروئین ایک شاپنگ سنٹر میں داخل ہوئی سیلزمین اسے رنگ برنگی ساڑھیاں دکھانے لگا۔ میں بھی چپکے سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نیلے گنبد کی طرف سے انارکلی میں آگیا اور وہ دکان تلاش کرنے لگا جس کے شوکیس میں تاج محل کا ماڈل دیکھ کر اسے خرید لینا چاہا تھا مگر میں نے منع کر دیا تھا اور کہا تھا "یہ میں تمہیں سالگرہ میں دوں گا۔"

وہ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی تھی پھر اس نے کہا تھا:

"تمھیں تکلیف ہوگی۔"

"مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے کہا تھا "تم لادو گے تو اس کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔" جلد ہی مجھے وہ دُکان مل گئی۔ قیمت طے ہو چکی تھی۔ میں نے جاتے ہی پیک کرنے کا آرڈر دے دیا مگر جب میں پیک کیا ہوا منی تاج محل لے کر دُکان سے باہر آرہا تھا سیڑھیوں پر میرا پاؤں رپٹ گیا اور ڈبہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر گر گیا۔ یقیناً وہ چکنا چور ہو گیا تھا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ دکان دار بھی کاؤنٹر چھوڑ کر باہر آگیا اس نے از راہ ہمدردی سلیوشن وغیرہ سے جوڑنے کی پیش کش بھی کی مگر میں اس قدر شرمندہ اور بدحواس ہو رہا تھا کہ جلدی جلدی وہاں سے نکل آیا۔ مجھ میں ڈبہ کھول کر دیکھنے کی ہمت تھی نہ دوسرا ماڈل خریدنے کی استطاعت۔ پھر اگر وہ سلیوشن سے جڑ بھی جاتا تو بھی تحفے میں نہ دیا جاسکتا تھا۔ خصوصاً اسے ... جو ذرا سا داغ یا پیوند بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ چیزوں میں بھی اور جذبوں میں بھی۔ گھر آکر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈبہ کھولا۔ وہ سچ مچ چکنا چور ہو گیا تھا اور اگرچہ اوپر کا درمیانی گنبد معہ محرابوں اور دروازوں کے سلامت تھا مگر نیچے کا چبوترہ جو درمیانی حصے اور میناروں کی بنیاد کا کام دیتا تھا جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ایک مینار کے دو اور دوسرے کے تین ٹکڑے ہو گئے تھے اور چبوترے یا پلیٹ فارم کے سامنے اور اطراف کی جالیاں اتنے بہت سے ٹکڑوں اور کرچیوں

میں تقسیم ہو گئی تھیں کہ ان کی اصل جگہ معلوم کرنا اور جوڑنا آسان نہ تھا۔ میں نے کاغذ کی کترنیں بھر کر دوبارہ اسے پیک کر دیا اور ڈبہ اٹھا کر چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ کافی دیر تک میں تکیے پر سر رکھ کر سوچتا رہا سمجھ نہ آتا تھا کہ کیا کروں سالگرہ میں جاؤں نہ جاؤں۔ جاؤں تو کیا لے کر جاؤں اور نہ جاؤں تو کیا بہانہ بناؤں۔ اسی دوران میں ایک مصرعہ سوجھ گیا جو میری اس وقت کی کیفیت کی بڑی اچھی عکاسی کرتا تھا تھوڑی سی اور کوشش کی تو دوسرا مصرعہ بھی ہو گیا۔ اب کیا تھا میں اسے تحفے میں دینے کے لیے نظم لکھنے بیٹھ گیا۔

وہ میری مشق سخن کا ابتدائی دور تھا۔ نظم شاید فنی اعتبار سے بہت اچھی نہ تھی مگر نہایت حسب حال تھی اس میں تاج محل خریدنے کے لیے میں نے جو فاقے کیے تھے اور جو ٹائم لگایا تھا اور کچھ کتابیں بیچی تھیں ان سب باتوں کا بھی ذکر تھا اور اس کے گر کر ٹوٹنے کا احوال بھی۔ اس کے ٹوٹنے کا جواز ذرا شاعرانہ انداز میں بتایا گیا تھا کہ وہ اس کے حسن و جمال کی تاب نہ لا سکتا تھا اس لیے سامنا کرنے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا اور ایک بڑی ندامت سے بچ گیا۔

نظم اسے اتنی پسند آئی کہ تاج محل بھول گیا بلکہ اگلے روز کہنے لگی:

"اچھا ہوا ٹوٹ گیا ورنہ تم اتنی عمدہ نظم کیسے لکھتے۔"

اس نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ اچھا ہوا تاج محل ٹوٹ گیا مگر تیسرے چوتھے روز صبح سویرے ہی آ گئی اور کہنے لگی "مجھے وہ ماڈل دے دو۔"

"اس کا کیا کرو گی۔ بالکل ٹوٹ گیا ہے بیکار ہو گیا ہے۔"

"میری چیز ہے جیسی بھی ہے بس مجھے دے دو۔"

"اچھا میں ویسا ہی دوسرا لا دوں گا۔"

"جی نہیں ۔۔۔ مجھے یہی چاہیئے۔ میں لے کر جاؤں گی۔"

میں نے ڈبہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے گاڑی سٹارٹ کی۔ میں نے کہا۔

"کاش میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں پتھر کی بجائے سونے کا تاج محل لا دیتا۔"

"مجھے سونے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم خواہ مخواہ غریبوں کی محبت کا مذاق اڑاتے۔"

"میں تمہیں سونے میں تول کر سارا سونا غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔"

"ہائے نہیں ..... تمہیں پتہ ہے میرا وزن کتنا ہے ؟"

"کتنا ہے ؟"

"پورے پچاسی پاؤنڈ۔"

"مجھے تولے ماشوں میں بتاؤ۔"

"تمہیں پتہ ہے میں حساب میں کمزور ہوں۔"

"سردار جی .... یہاں آپ کے ہاں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کس کے ساتھ؟" سردار جی نے قہقہہ لگایا۔

"سونا .... گولڈ۔"

"شئیت تین ہزار ایک تولے کا۔"

میں نے چاہا پونڈوں کے تولے بنا کر ان کو تین ہزار سے ضرب دوں مگر اسی لمحے عزیز مصر کی سواری آگئی۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔

بردے کی صفتیں بیان کرنے والا دلال چبوترے سے اتر آیا۔ محلوں میں بیٹھ کر بولی لگواتی بیگمات پریشان ہوگئیں۔ مول تول کرتے بیوپاری چپ ہو گئے بادشاہ کے مقابلے میں کون بولی دے سکتا تھا۔

"نیلام جاری رہے" بادشاہ نے دلال کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ آداب بجا لایا اور دوبارہ چبوترے پر چڑھ کر پکارا:

"ہے کوئی خریدنے والا .... ایک حسین لطیف اور خوش طبع عبرانی غلام کو جس کی نظیر دنیا میں نہیں۔"

" ہمارے سوا اسے کون خرید سکتا ہے" بادشاہ نے پُرجوش آواز میں کہا "مالک سے پوچھو کیا مانگتا ہے ہم اسے ہر قیمت پر خریدنا چاہتے ہیں۔"

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

مالک ہجوم کو پیچھے ہٹاتا آگے آیا تعظیم کے بعد بولا:

"جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔"

" امان دی۔ تم عرض کرو۔"

عالی جاہ ۔۔۔ کیا مجھے اس کے ہم وزن سونا عطا ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں۔" بادشاہ نے بردے کی طرف ایک نظر دیکھ کر کہا " ہمارے خزانوں کے مقابلے میں اس کا وزن ہی کتنا ہے؟"

وزیروں کو حکم ہوا۔ شاہی خزانہ لایا جائے اور ایک بڑے ترازو کا انتظام کیا جائے۔ آن کی آن میں شاہی حکم کی تعلیم ہو گئی۔ ترازو لایا گیا۔ مسلح پہریداروں کی نگرانی میں سروں پر زر و جواہرات کے بڑے بڑے طشت اٹھائے باوردی غلام حاضر ہو گئے۔ نوعمر، پژمردہ اور غریب الدیار بردے کو ایک پلڑے میں بٹھا دیا گیا۔ دوسرے پلڑے میں سونے کی خالص مہروں اور جواہرات سے بھرے طشت الٹائے جانے لگے۔ خلقت دم بخود رہ گئی جب باری باری سارے طشت خالی ہو گئے مگر بردے والا پلڑا زمین سے نہ اٹھ سکا۔ خازن کو پسینہ آ گیا۔ امیر وزیر انگشت بدنداں نظر آنے لگے۔ بادشاہ پریشان ہو گیا، بولا:

" یہ برکت والا نازک اندام غلام ہمیں دے دو۔ ہم شرط ہار گئے۔ ہم اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔"

اسے محل میں لایا گیا۔ مشک و عنبر سے نہلایا اور اطلس و کمخواب کی پوشاک پہنائی گئی۔ اور مصر شہر کی ملکہ اس کے ناز اٹھانے کے لیے ایک ادنیٰ کنیز کی طرح اس کی خدمت میں حاضر رہنے لگی۔

اس نے ٹوٹے پھوٹے تاج محل کی مرمت کروالی اور اسے جھاڑ پونچھ کر ایک ایسی بلند جگہ پر رکھوا دیا جہاں اسے کوئی چھو نہ سکے اور وہ دیکھنے میں سلامت نظر آئے۔ کہنے لگی۔

"میں اسے کبھی خود سے جدا نہ کروں گی۔"

مگر کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اتنا ہی جتنا اصلی تاج محل اور اس کے ریپلیکا میں۔ وہ ماڈل اسی جگہ پڑا رہ گیا اور وہ اسے چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی۔ شاید کسی بڑے اور اصلی تاج محل میں۔ اور میرا حال اس ماڈل کا سا ہو گیا جو دیکھنے میں سالم نظر آتا تھا مگر ذرا سے چھونے سے اس کے ٹکڑے الگ ہو جاتے۔

"کیہ گل اے ویر جی؟" سردار جی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے پوچھا "آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

"نہیں تو" میں نے جلدی سے آنکھیں صاف کر کے جواب دیا "شاید مجھے زکام ہو رہا ہے۔"

سردار جی شاید کچھ اور بھی پوچھتے مگر فلائنگ کوچ ایک مڈوے ریستوران کے احاطے میں داخل ہو کر رک گئی۔

دھوپ اب خوب چمک رہی تھی۔ دھند اور غبار بھی چھٹ گیا تھا ہلکی ہلکی خنکی تھی گرم گرم چائے اس وقت بہت اچھی لگی۔

تھوڑی دیر بعد کوچ دوبارہ روانہ ہوئی تو سڑک کے کنارے ایک جگہ سوّروں کا ریوڑ دکھائی دیا۔ میرے اندر محمد بوٹا گجراتی اپنی سی حرفی گنگنانے لگا۔

خوک چار دے بوٹیا عشق پچھے کئی ولی کمال سدان والے

سردار جی نے سوّروں میں میری دلچسپی کو بھانپتے ہوئے پوچھا:

"ادھر نہیں ہوتے؟"

"ہوتے ہیں۔ مگر کھیتوں اور جنگلوں میں چھپ کر رہتے ہیں۔"

"یہاں تو بہت ہیں۔ پالے جاتے ہیں۔"

"ہمارے ہاں خود پلتے رہتے ہیں۔ کھیت اور فصلیں اجاڑ دیتے ہیں۔"
"یہ ہر جگہ ایسا ہی کرتے ہیں سنا ہے آپ کے ہاں تو یہ گالی ہے۔"
"ہاں۔ ہمارے ہاں ان کا نام نہیں لیا جاتا۔ ان کو باہرلا یعنی باہر والا کہتے ہیں۔"
"باہر والا کیوں کہتے ہیں۔"
"سور یا خنزیر کہنے سے زبان پلید ہوتی ہے۔"
سردار جی کسی بچے کی طرح کھل کھلا کر ہنسے۔
"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے سردار جی۔"
"آپ کی زبان پلیت ہو گئی" وہ ہنستے ہوئے بولے۔
"کوئی بات نہیں" میں نے بھی ہنس کر جواب دیا" میں اتر کر کلی کر لوں گا۔"
"ویسے ویر جی" سردار جی اچانک سنجیدہ ہو گئے" اس کو اندر والا کہنا چاہیئے۔"
"اندر والا؟"
"ہاں۔ دنیا میں ہر کہیں ساری گڑبڑ اسی اندر والے کی وجہ سے ہے۔"
"آپ نے ٹھیک کہا۔"
"اب دیکھو نا جی۔ ادھر بھی یہی حرام زادے آپ کی فصلیں اجاڑتے ہیں اور ادھر بھی۔ کھا کھا کر پھٹ گئے ہیں۔"
فلائنگ کوچ سکندرہ میں اکبر اعظم کے مقبرے پر تھوڑی دیر رک کر آگرہ شہر میں داخل ہوئی تو فرطِ جذبات سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں بھی چپ تھا مگر میرے اندر کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا تھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر ہم اس ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پر کھڑے رہے جہاں سے پورا تاج محل نظر آتا ہے اور پہلی جھلک میں ہر دیکھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے کہنے لگی۔
"وہ ہزاروں معمار، مزدور، سنگتراش اور نگران عملے کے لوگ جو بیس بائیس

برسوں تک یہاں کام کرتے اور اپنے ہاتھوں سے اسے اسارتے رہے ہیں یقیناً انھوں نے بھی محبت کی ہوگی ان کی بھی اپنی اپنی ممتاز محل ہوں گی۔"

"ہاں" میں نے جواب دیا" شاید ان میں سے بہت سوں نے اپنی اپنی ممتاز محل کو یہاں دفن بھی کر دیا ہو۔"

"مجھے بھی تم ..... !" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی اور وہ خوف زدہ ہوگیا پھر جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اتر گیا۔ ہم نے تاج محل کے سامنے حوضوں، فواروں اور روشوں پر کھڑے ہو کر علیحدہ علیحدہ اور ایک ساتھ بہت سی تصویریں اتروائیں۔ ایک جگہ بورڈ لگا تھا اس سے آگے تصویر بنانا منع ہے۔ میں نے کیمرہ بند کر لیا اور اسے ساتھ لے کر تاج محل کی طرف بڑھا۔ پھر ہم نے وہ پلیٹ فارم دیکھا جو ڈبہ گرنے سے خاصا ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ کچھ دیر ہم وہاں کھڑے رہے پھر سیڑھیاں چڑھ کر اس چبوترے پر آئے جو عظیم درمیانی گنبد اور میناروں کی بنیاد کا کام دیتا تھا اور جس کی اس نے پلاسٹر آف پیرس کے ذریعے مرمت کروالی تھی۔

"یہ جالی یہاں سے وہاں تک ٹوٹ گئی تھی۔" اس نے چبوترے سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہاں اور یہ حصّہ تو بالکل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔" میں نے چبوترے کو قدموں سے ناپتے ہوئے کہا۔

"یہ وہ مینار ہے جس کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔" وہ بولی۔

" اور اس مینار کے تین ٹکڑے ہو گئے تھے اور مرمت کے بعد بھی وہ ٹیڑھا نظر آتا تھا۔"

"ہاں" اس نے اتفاق کیا۔

میرا جی چاہ رہا تھا جالیوں، دیواروں اور میناروں کو چھو کر دیکھوں مگر

ڈر لگتا ہے چھونے سے کوئی ٹکڑا الگ ہو کر نہ گر پڑے۔

ایک روز اس کی چھوٹی بہن کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ اس کی گرد جھاڑنے لگی تو اس کے ٹکڑے الگ ہو گئے۔ اور پھر ان کو جوڑا نہ جاسکا کافی عرصہ تک وہ ٹوٹا پھوٹا اِدھر اُدھر رلتا رہا پھر کسی نے اٹھا کر کوڑے کے ڈرم میں ڈال دیا۔

ہم درمیانی گنبد کے اندر اس ہال میں آئے جہاں بادشاہ اور ملکہ کی قبروں کے تعویذ تھے۔ ہم نے فاتحہ خوانی کی۔ تعویذ کی منقش اور رنگین پتھروں سے بنی جالیوں کو دیکھا۔ گنبد میں دیر تک سنائی دیتی رہنے والی گونج سنی۔ اور باہر آ گئے۔ میں نیچے والی اصلی قبروں کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی مگر اسے قبروں سے ہمیشہ بڑی دلچسپی رہی ہے کہنے لگی:

"نیچے چلو ابھی دعا پڑھ کر واپس آجائیں گے۔"

پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی:

"اچھا تم یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ سیڑھیاں اتر کر چلی گئی۔ میں کچھ دیر اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب اسے گئے کافی دیر ہو گئی تو میں اسے ڈھونڈتا ہوا نیچے آیا وہاں کافی رش تھا۔ میں نے گھوم پھر کر دیکھا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا باہر آگیا اور ہر جگہ اسے ڈھونڈھا مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ تھک کر میں ڈیوڑھی کی ان سیڑھیوں پر آ بیٹھا جہاں سے ہر آنے جانے والا گزرتا ہے۔ خوب صورت عورتیں، نئے بیاہتا جوڑے اور جواں سال لڑکے لڑکیاں آجا رہے تھے۔ مگر اس کا دور دور تک نشان نہ تھا۔

مجھے اسی روز دلی پہنچنا تھا۔ اگلے روز میری واپسی کی سیٹ کنفرم ہو چکی تھی۔ میں بوجھل دل کے ساتھ اکیلا ہی لوٹ آیا۔

لاہور آکر میں نے فلم دھلوائی۔ بڑی اچھی تصویریں آئی تھیں۔ مگر وہ تصویروں میں بھی غائب تھی۔

2320
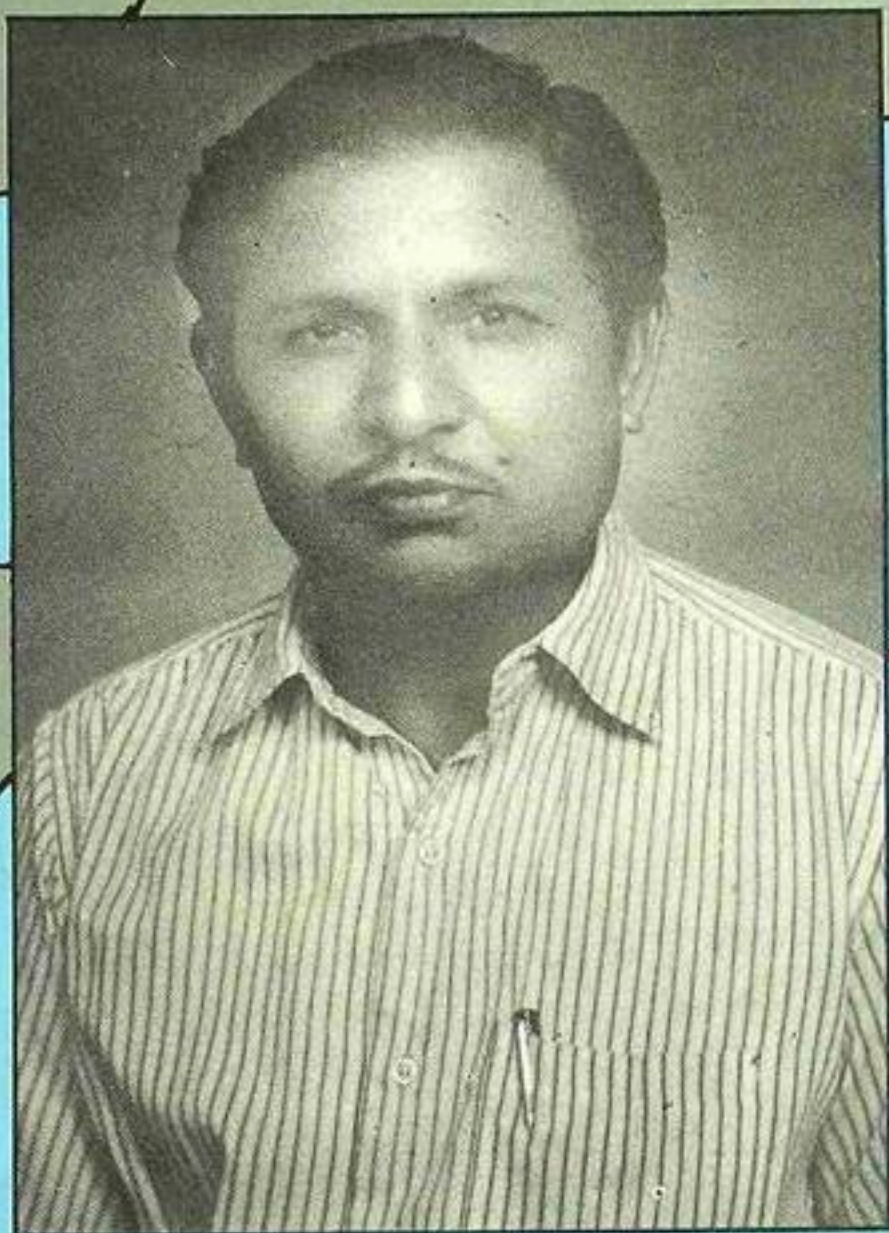
محمد منشایاد

ادب پبلیکیشنز، نئی دہلی